ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اکتوبر سنہ ۱۹۹۲ء

قیمتی تحفہ

تفصیلات صفحہ نمبر ۱۲ پر

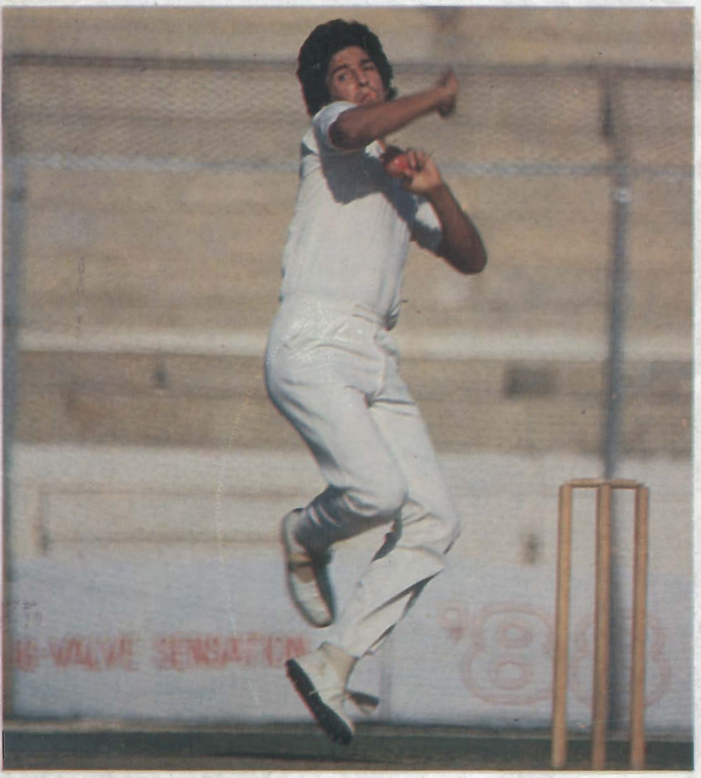

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جُستجُو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔ ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں، جہاں وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان اِنٹرنیشنل
باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

جی ہاں! آنکھ مچولی کا مقابلہ آنکھ مچولی ہی سے ہے

اپنی روایات کو ہم خود ہی آگے بڑھاتے ہیں

کرکٹ اسپیشل، قہقہہ نمبر، خوفناک نمبر، حیرتناک نمبر، اطفال نمبر، عالمی ادب نمبر اور کشمیر نمبر

کے بعد اب

آنکھ مچولی کی ایک نئی اور انوکھی پیشکش

جنوری ۹۳ء میں منظرِ عام پہ آ رہا ہے

ایجادات نمبر

روئے زمین پر انسان نے آج تک جتنی اہم چیزیں ایجاد کی ہیں ان کی دلچسپ، حیرت انگیز اور سچی کہانیاں

سائنس کی سائنس، کہانی کی کہانی

یہ چیزیں کیسے ایجاد ہوئیں؟

پہیہ، انجن، بلب، کاغذ، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، کار، ریڈیو، ٹیلی وژن، راکٹ، ایٹمی بجلی گھر، دوائیں اور دیگر اشیاء —

خصوصی شمارہ میں پڑھیے

لفظ لفظ تحقیق — حرف حرف حقیقت

آپ بھی لکھیے

اگر آپ کسی سائنسی ایجاد کی کہانی لکھنا چاہیں تو ضرور لکھئے — لیکن جس کتاب سے معلومات حاصل کریں اس کا حوالہ دینا نہ بھولئے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دینا آنکھ مچولی کی روایت ہے

قسمت کس کی اچھی ہے
نصیب کس کے جاگتے ہیں؟

آنکھ مچولی آپ کو ایک قیمتی کیمرہ تحفے میں دینا چاہتا ہے

قیمتی کیمرہ
وہ بھی مُفت

دیکھیں خوش بختی کی چڑیا کس کے سر بیٹھتی ہے
کون خوش نصیب قیمتی کیمرہ حاصل کرتا ہے

ہمیں یہ مکمّل صفحہ کوپن میں اپنا نام، ولدیت، اسکول اور مکمّل پتہ لکھ کر بھجوا دیجئے
ہم آپ میں سے کسی ایک خوش نصیب ساتھی کو تحفتاً قیمتی کیمرہ دینے کا اعلان کریں گے

نام ________ ولدیت ________

عمر ________ کلاس ________ اسکول ________

پتا جہاں کیمرہ بھجوایا جائے ________

________ فون ________

ہمارا پتا :۔ ماہنامہ آنکھ مچولی ۰ ۱۰۔ پی آئی بی کالونی ۰ کراچی ۵

کوپن بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۱ ؍ اکتوبر ہے۔ ستمبر کے تحفے کا اعلان نومبر ۹۲ء کے شمارے میں کیا جائے گا۔

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۷، شمارہ ۴ ربیع الثانی، جمادی الاوّل ۱۴۱۳ھ، اکتوبر ۱۹۹۲ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول
ایم اے فاروقی
مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد
مدیر اعزازی
طاہر مسعود
مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔
• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا
• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۷ ا-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ ۷۴۸۰۰ فون : ۱۵۸۷

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

قیمت دس روپے
۷ درہم، ۷ ریال

آنکھ مچولی کی اپیل

رسالے کی کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ وطنِ عزیز پہ آزمائش کی سخت گھڑی آپہنچی۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق منہ زور سیلاب سیکڑوں گاؤں، دیہاتوں اور قصبوں کو ڈبو چکا ہے۔ ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں لاتعداد افراد بے گھر ہو کر کھلے آسمانوں کے نیچے بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ مویشی بہہ گئے ہیں اور کھیت کھلیان ڈوب چکے ہیں۔ ملک کو اربوں روپوں کا نقصان پہنچ چکا ہے۔

قوموں کی زندگی میں آزمائش کے نازک لمحات آتے رہتے ہیں زندہ قوم کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان آفتوں اور مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جائیں اور سیلاب سے متاثرہ اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے جو کچھ بھی بن پڑ سکتا ہے ضرور کریں۔ وزیرِ اعظم نے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ریلیف فنڈ قائم کر دیا ہے۔ اگر ہر شخص ایک روپیہ بھی اس فنڈ میں جمع کرائے تو کروڑوں روپے جمع ہو سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ آگے بڑھیں اور اس کام کو بڑھ چڑھ کر انجام دیں۔ خصوصاً متاثرہ علاقوں کے قرب و جوار میں رہنے والے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ امدادی سامان مثلاً کپڑے، چادریں، کمبل، کھانے پینے کی اشیا اور دوائیں غرضیکہ جتنی چیزیں بھی جمع ہو سکتی ہیں، جمع کریں اور ضرورت مندوں تک پہنچائیں۔

یاد رکھئے! باوقار قوموں کا یہ شعار نہیں کہ وہ اپنی ضرورت کے لئے غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ مصیبت کی اس گھڑی میں ہمیں اپنی مدد آپ کرنی چاہئے اور قدرت کے اس کڑے امتحان میں پورا اتر کے دکھانا چاہئے۔

خدائے بزرگ و برتر سے دُعا ہے کہ وہ مستقبل میں ہمیں ایسی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

(آمین)

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے ——— محمد احمد – ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ——— ظفر محمود شیخ – ۹
معصوم کھیل ——— شاہد صدف – ۱۰
روشنی کے مینار ——— ادارہ – ۱۱
آپا ثمین ——— مس فرحین – ۱۴
سومنات کی دہلیز پر ——— عبدالستار خان – ۲۰
رنج کی جب گفتگو ہونے لگی ——— عبدالقادر – ۲۶
پھل دینے والا درخت ——— رؤف اسلم آرائیں – ۲۸
سانپ رے سانپ ——— نیاز احمد مدنی – ۳۴
سنگدل ——— شگفتہ شمیم – ۳۸
تصویری کہانی ——— ادارہ – ۴۲
نووی کی بلّی (نظم) ——— شبیر بیگ ناز – ۴۵
ہم سب نافرمان ہیں ——— امتیاز جلیل – ۴۶
بوجھو تو جانیں ——— ادارہ ۵۲
بچو بٹیٹس سے بچو ——— طلعت جاوید – ۵۵
کتّا اور چور ——— محسن خان – ۵۷
تین رنگوں والی تتلیاں ——— تمثال مسعود – ۶۴
گُدگُدے ——— لطائف – ۶۷
تھیٹر کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ——— خرم امجد کرمانی – ۷۱
فتح ——— خرم معراج سید – ۷۴
بخدمت جناب ——— خطوں کے جواب – ۷۸
اُڑان ——— ذیشان بن صفدر – ۸۲
کوّہ فوجی ——— سہیل احمد صدیقی – ۸۷
لالی ——— محمد علی انصاری – ۹۰
آنکھ مچولی البم ——— ادارہ – ۹۴
صفر کی واپسی ——— زاہد منان قریشی – ۹۶
چیزوں کی کہانی ——— آصف فرّخی – ۱۰۰
سیارہ عطارد ——— سید ذیشان احمد زکریا – ۱۰۳
کرشمہ ——— اظہر نیاز – ۱۰۷
نئی نسل کو کس نے تباہ کیا ——— ہُما میر – ۱۱۵
خواب کیا ہیں؟ (نظم) ——— اکبر علی خان عرشی زادہ – ۱۱۸
قلم قتلے ——— ننھّی تحریریں – ۱۱۹
ساتھی بچپن کے ——— تعارف – ۱۳۱

تاریخ کے دریچے سے

زاہد ابو غیاث، بخارا کے قبرستان میں رہا کرتے تھے۔ ایک روز اپنے بھائی سے ملاقات کے لئے شہر چلے گئے۔ حاکم نصر ابن احمد کا لڑکا گانے بجانے والوں کے ساتھ اس طرح اپنے گھر سے نکل رہا تھا، کہ ان کے ساتھ گانے بجانے کا سامان بھی تھا۔ ابو غیاث نے سوچا یہ بڑا سخت موقع ہے اگر میں اس وقت خاموش رہا تو اس گناہ میں بھی شامل ہوں گا۔ پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر اللہ سے مدد مانگی اور لاٹھی سنبھالی اور ایک دم ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لوگ اُلٹے پاؤں حاکم کے محل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور حاکم کو پورا قصہ سنایا اس نے فوراً ابو غیاث کو طلب کیا۔

حاکم...... کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ جو شخص حاکم و بادشاہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

ابو غیاث...... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص رحمٰن کے ساتھ بغاوت کرے اس کو آگ میں داخل کیا جاتا ہے۔

حاکم...... آپکو امر بالمعروف و نہی عن المنکر (یعنی نیکی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے) کا ذمہ دار کس نے بنایا؟

ابو غیاث...... اس ذات نے جس نے آپ کو حکومت دی۔

حاکم...... مجھے تو خلیفہ المسلمین نے حاکم بنایا۔

ابو غیاث...... مجھے یہ ذمہ داری خلیفہ کے رب نے سونپی۔

حاکم...... میں آپ کو سمرقند کا امر بالمعروف (نیکی کو پھیلانے) کا ذمہ دار بناتا ہوں۔

ابو غیاث...... میں اس عہدے سے استعفٰی دیتا ہوں۔

حاکم...... آپ بھی عجیب آدمی ہیں جب یہ ذمہ داری آپکو سونپی نہیں گئی تھی تو آپ مفت میں یہ کام انجام دیتے تھے اور جب آپ کو اس عہدے پر مقرر کیا جاتا ہے تو آپ اس سے رک رہے ہیں۔

ابو غیاث...... اگر آج آپ مجھے اس عہدہ پر بٹھائیں گے تو کل معزول بھی کر دیں گے، اور جب میرا رب اس عہدے پر مقرر کرے گا تو مجھے کوئی شخص معزول نہیں کر سکتا۔

حاکم...... مانگئے جو آپ کو مانگنا ہے۔

ابو غیاث...... آپ مجھے میری جوانی لوٹا دیں۔

حاکم...... یہ کام میرے اختیار میں نہیں، اس کے علاوہ اور کوئی ضرورت و فرمائش ہو تو بتائیں۔

ابو غیاث...... آپ دوزخ کے دروازے کے داروغہ کو یہ خط لکھ دیں کہ مجھے عذاب نہ دے۔

حاکم...... یہ بھی میرے اختیار میں نہیں اسکے علاوہ اور کوئی ضرورت ہو تو بتلائیں۔

ابو غیاث...... آپ جنت کے داروغہ رضوان کو یہ لکھ بھیجیں کہ مجھے جنت میں داخل کر دے۔

حاکم...... یہ کام بھی میرے دائرہ اختیار میں نہیں۔

ابو غیاث...... یہ تمام امور اس رب کے قبضہ میں ہیں جو تمام حاجات و ضروریات اور تمام چیزوں کا مالک ہے۔ میں اس سے جو چیز بھی مانگتا ہوں وہ مجھے عطا فرما دیتا ہے...... یہ سن کر حاکم نے ان کو جانے کی اجازت دے دی۔

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

عزّت ان ہی کو ملتی ہے جو دوسروں کی عزّت کرتے ہیں۔

آپ نے ایسے نوجوان بھی دیکھے ہوں گے جو بد تمیز بھی ہوتے ہیں اور بد کلام بھی۔ کسی نہ کسی وجہ سے ان کا دماغ غرور سے بھرا ہوتا ہے اور وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ بزرگوں کا احترام کرنا اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا جنہیں آتا ہی نہیں۔ جن کی یہ خواہش تو ہوتی ہے کہ دوسرے انہیں اہمیت دیں، ان پر توجہ کریں لیکن دوسروں کے معاملے میں ان کا اپنا رویہ شائستہ اور مہذّب نہیں ہوتا۔ بڑوں اور بزرگوں سے گفتگو کریں گے تو لب و لہجہ ایسا ہو گا جیسے اپنے کسی یار دوست سے مخاطب ہوں۔ ان کی کسی نامناسب حرکت کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی تو کٹ حجتی پہ اتر آئیں گے اور ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دیں گے۔ بڑوں سے اختلاف کریں گے تو بار بار کہیں گے۔ "آپ نہیں جانتے۔ آپ کو معلوم ہی کیا ہے۔" آپس میں چند دوست اکٹھے ہوں گے تو اس کی پروا نہ ہوگی کہ آس پاس بزرگ بیٹھے ہیں۔ شور شرابا، بد تمیزی اور بد کلامی سے سارے ماحول کو پراگندہ کر دیں گے۔ انہیں احساس تک نہ ہو گا کہ اپنی حرکتوں سے وہ دوسروں کے لئے تکلیف اور کوفت کا باعث بن رہے ہیں اور دیکھنے والی نظروں میں اپنے آپ کو گرا رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ سارے نوجوان اس مزاج اور کردار کے نہیں ہوتے۔ لیکن ان نوجوانوں کی صحبت اچھے گھرانوں کے لڑکوں کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔ تعلیم کا مقصد آدمی کو مہذّب بنانا ہے۔ اور انکساری اس چیز کا نام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اور معاشرے میں اپنے مقام کو پہچانے۔ بزرگوں کی عزّت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک دن آپ کا شمار بھی بزرگوں میں ہونا ہے۔ اگر بزرگوں کے ادب کرنے کی روایت کو آپ نے آج قائم نہ رکھا تو کل آنے والی نسل آپ کو بھی عزّت و احترام سے محروم کر دے گی۔

لہٰذا یہ فیصلہ آپ کو ابھی کرنا ہے کہ باادب ہو کر آپ بانصیب بننا چاہتے ہیں یا بے ادب ہو کر بد نصیب............!

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

معصوم کھیل

شاہدہ صدف

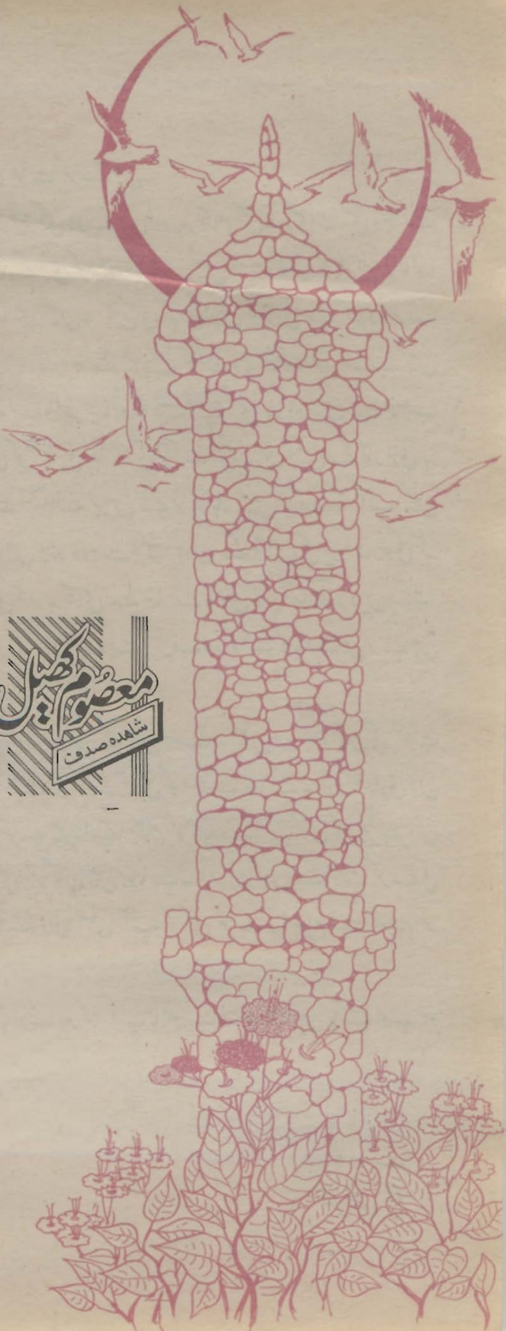

چھوٹے سے تھے حضورؐ جب
عمر تھی چند سال کی
آپ کے حسنِ ذوق کی
ملتی نہیں مثال . تھی
بچوں میں کھیلتے نہ تھے
لڑکوں میں بیٹھتے نہ تھے
بے وجہ بولتے نہ تھے
ہر بات تھی کمال کی
پتھر اُٹھا اُٹھا کے آپ
لاتے تھے اپنے ہاتھ سے
ایک پر ایک رکھ کے پھر
غور سے ان کو دیکھتے
فنکار کوئی جس طرح
ڈوبا ہوا ہو سوچ میں
گم ہو کسی خیال میں
ایک تھی آپ کی کزن
نام تھا اس کا عربدہ
حیرت سے آ کے دیکھتی
کیا عجیب کھیل ہے
کہتے تھے مسکرا کے آپ
مینار بن رہا ہے یہ
اور اس پہ چڑھ کے ایک دن
اپنے خدائے پاک سے
باتیں کیا کروں گا میں
ہنستی تھی عربدہ بہت
آپ بُرا نہ مانتے
کہتے کہ جیت جاؤں گا
مینار میں بناؤں گا

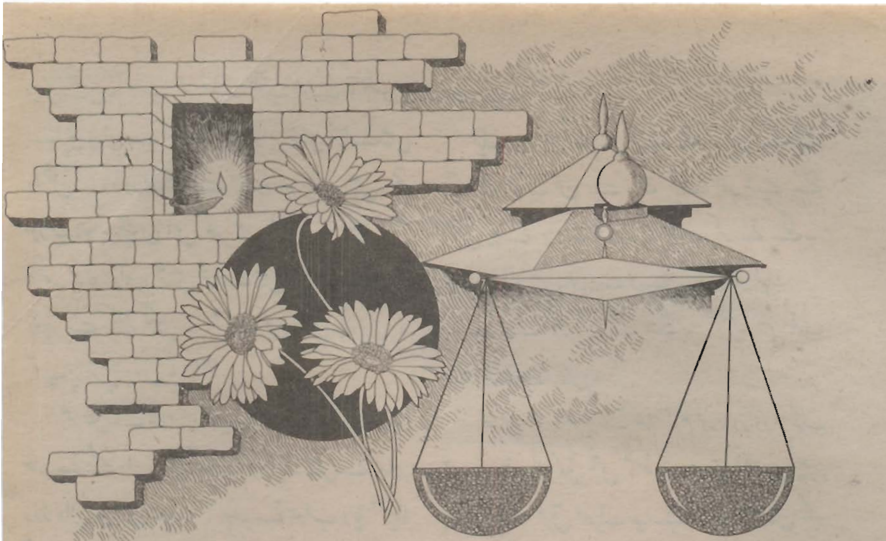

روشنی کے مینار

ادارہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت کے زندہ اور روشن واقعات

عمر بن عبدالعزیز کو اگرچہ خلیفہ سلیمان نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام نے متفقہ طور پر انہیں اپنا خلیفہ چنا تھا۔

جب ان کے انتخاب کے بارے میں عوام کا فیصلہ انہیں پڑھ کر سنایا گیا تو وہ رو پڑے۔ کہنے لگے، "واللہ میں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی تھی۔"

داروغۂ اصطبل ان کی سواری کے لئے شاہی گھوڑا لے کر آیا تو خلیفہ نے کہا "مجھے یہ نہیں چاہئے۔ میرے لئے خچر ہی ٹھیک ہے۔"

"حکم بن عمر سے روایت ہے کہ جب خلیفہ عمر کے سامنے شاہی گھوڑوں کے اخراجات اور ان کے ملازموں کی تنخواہوں کے بل منظوری کے لئے پیش ہوئے تو انہوں نے کہا۔ ان گھوڑوں کو شام کے مختلف شہروں میں لے جا کر بیچ دو اور جو رقم ملے اسے شاہی خزانے میں داخل کر دو۔"

"خلیفہ عبدالملک نے اپنی بیٹی فاطمہ کو قیمتی جواہر دیئے تھے۔ فاطمہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی

بیوی تھیں۔ جب عمر خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ "یہ جواہر شاہی خزانے میں داخل کر دو ورنہ مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں، تم اور یہ جواہر تینوں اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔"

فاطمہ نے جواہر، شاہی خزانے میں جمع کر دیئے اور شوہر سے کہنے لگیں۔ "بھلا ان قیمتی پتھروں کو آپ پر ترجیح دوں گی؟"

عمر ثانی کے غلام ابو امیہ کہتے ہیں کہ "ایک روز ملکہ نے مجھے دال روٹی کھانے کو دی۔ میں نے کہا ہر روز دال ہی ملتی ہے۔" ملکہ نے جواب دیا "بیٹا تمہارے آقا بھی ہر روز یہی کھاتے ہیں۔"

ایک دن عمر ثانی نے اپنی بیوی سے کہا "تمہارے پاس ایک درہم ہو تو مجھے دو میں انگور خریدنا چاہتا ہوں" بیوی بولیں "آپ کے پاس انگور خریدنے کے لئے ایک درہم بھی نہیں؟"

خلیفہ نے کہا "درہم اپنے پاس نہ رکھنا دوزخ کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے۔"

سید ابن سویر کہتے ہیں۔ عمر جب نماز جمعہ کے لئے مسجد میں آتے تھے تو ان کے لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے کہا "یا امیرالمومنین! اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے، پھر کیا آپ کپڑے بھی اچھے نہیں پہن سکتے؟"

خلیفہ نے سر جھکا لیا اور سوچ کر جواب دیا "امارت رکھتے ہوئے اعتدال سے اور طاقت رکھتے ہوئے عفوو درگزر سے کام لینا نہایت قابل تعریف بات ہے۔"

ایک روز عمر گھر میں بیٹھے تھے کہ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ ان سے ملنے آئے اور اپنے لئے بعض بڑے بڑے عہدے طلب کرنے لگے۔

خلیفہ نے انہیں عہدے دینے سے انکار کیا۔

وہ لوگ بگڑ کر کہنے لگے۔ "کیا ہم آپ کے رشتے دار نہیں۔"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا "تم اور دور دراز ملک میں رہنے والا کوئی بھی مسلمان میری نظروں میں برابر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان مجھ سے الگ ہے اور تم یہاں میرے پاس ہو اور اس کی وجہ محض طویل مسافت ہے۔"

ایک روز عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ملازم سے کہا کہ میرے لئے پانی گرم کرو، ملازم ایک کیتلی میں سرکاری مطبخ (باورچی خانہ) سے پانی گرم کر کے لے آیا۔ عمر کو معلوم ہوا تو انہوں نے ملازم کو ایک درہم دیا کہ اس کا ایندھن خرید کر سرکاری مطبخ میں ڈال آؤ۔"

خلیفہ عمر سرکاری کام کرتے وقت موم بتی روشن کر لیتے تھے اور جب سرکاری کام ختم ہو جاتا تھا تو موم بتی بجھا کر اپنا معمولی دیا جلا لیتے تھے۔

عمرو بن مہاجر کہتے ہیں۔

ایک دفعہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو سیب کھانے کی خواہش ہوئی ان کے ایک عزیز نے انہیں تحفتہ ایک سیب دیا خلیفہ نے سیب ہاتھ میں لیا اور سونگھ کر کہنے لگے "اس کی خوشبو کتنی دلآویز ہے اور یہ

کتنا خوبصورت ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے غلام کو بلایا اور اس سے کہا کہ "اسے اس کے مالک کے پاس لے جاؤ، اس سے ہمارا اسلام کہو اور کہو کہ ہم اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔"

"عمر بن مہاجر نے خلیفہ سے پوچھا" یا امیرالمومنین جس نے یہ سیب بھیجا ہے وہ آپ کا چچازاد بھائی ہے۔ علاوہ ازیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تحفے میں دیا ہوا پھل وغیرہ کھا لیا کرتے تھے "عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تحفے پیش کئے جاتے تھے وہ سچ مچ تحفے ہوتے تھے۔ لیکن موجودہ حالات میں میرے لئے یہ تحفہ نہیں بلکہ رشوت ہے۔"

"ابن حیاتؒ کہتے ہیں" ایک رات میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز سے باتیں کر رہا تھا۔ کمرے میں جو چراغ روشن تھا اس کی روشنی دھیمی پڑ گئی ساتھ والے کمرے میں ان کا ملازم سو رہا تھا" میں نے خلیفہ سے کہا اگر آپ کہیں تو جا کر ملازم کو جگاؤں" عمر نے کہا "نہیں، اس کی نیند خراب ہوگی۔"

میں نے کہا" تو میں خود چراغ میں تیل ڈال لوں؟" عمر نے جواب دیا، "یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ اس وقت میرے مہمان ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خود اٹھے۔ چراغ میں تیل ڈالا، اس کی بتی درست کی اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "میں جب اٹھ کر یہ کام کرنے گیا تھا اس وقت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھا اور اب واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ جانے کے بعد بھی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہوں۔"

"خراساں کے حاکم جراح ابن عبداللہ نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو لکھا "خراساں کے لوگ غیر مہذب ہیں انہیں قابو میں لانا آسان نہیں مجھے ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے۔"

خلیفہ نے جواب بھیجا "آپ خراساں کے لوگوں پر تلوار کے زور سے قابو پانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ طریقہ غلط ہے آپ ان کے ساتھ انصاف اور سچائی کا برتاؤ کریں، اس طرح آپ ان کا دل موہ لیں گے۔"

(۱) وہ گھر جس میں کتابیں نہ ہوں اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو۔

امیر خسروؒ۔

(۲) نادان بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہے جس پر دانا، مگر بڑی خرابی کے بعد۔

شیخ سعدیؒ۔

(۳) اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

شیخ سعدیؒ۔

(۴) عقلمند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔

سقراط۔

یاسر بن نثار۔ راولپنڈی

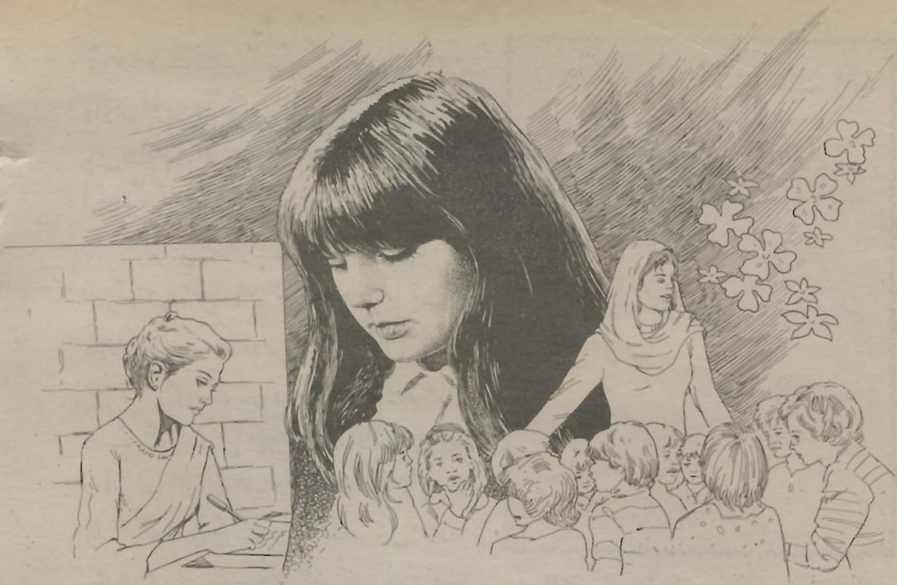

آپا ثمین

مس فرحین

ان لوگوں کے نام جو بچوں کو پھول، جگنو، ستارے، خوشبو، رنگ اور تتلیاں سمجھتے ہیں۔

خزاں کے زرد گرتے ہوئے پتوں نے موسم کو اور بھی زیادہ اداس بنا دیا تھا اور ننھی مُنی برستی ہوئی بوندیں باغ میں لگے ہوئے درختوں اور پھولوں کی گود میں یوں گر رہی تھیں جیسے وہ آسمان کے قید سے آزادی کے بعد خوش ہوں۔ ہم سب خاموش تھے مگر ہمارے اندر کسی کی یادیں گفتگو کر رہی تھیں۔ آپا ثمین اس دنیا میں خوشبو کی مانند آئیں جو لمحہ بھر میں گزر تو گئی مگر دل و دماغ کو معطر کر گئی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی، اور آپا ثمین اس وقت

دسویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ امی، پاپا، آپا ثمین اور میں بس یہی ہمارے گھر کے افراد تھے۔ ہمارا گھر بے حد بڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سب ایک دوسرے سے ذرا دور دور رہتے تھے۔ پاپا کو اپنی مصروفیات کے علاوہ کچھ عزیز نہ تھا۔ البتہ آپا ثمین امی پاپا سے بالکل مختلف تھیں، انہیں پھولوں سے جنون کی حد تک پیار تھا اور وہ بچوں کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ جمعدار کے بچے ہوں، مالی کے یا فقیر کے، آپا سب کو چاہتی تھیں۔ ان کے خیال میں بچے سارے بچے ہوتے ہیں۔ سارے بچے خوشیوں کی آرزو مند ہوتے ہیں۔ اس لئے سب کو خوشیاں ملنی چاہیں۔ آپا اگرچہ خود ابھی اتنی بڑی نہ تھیں مگر وہ مجھے امی سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ میری پسند کے کھانے بناتیں ہوم ورک کرانے میں مدد دیتیں اور شام کو مجھے بچوں کے پارک لے جاتیں، جہاں میں اور آپا ثمین بے شمار بچوں کے ساتھ کھیلتے۔ اس وقت آپا ثمین کے چہرے پر کئی رنگ ہوتے۔ خلوص کے، محبت کے اور دعاؤں کے رنگ۔

اپنے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد پاپا اور امی سے آپا نے ضد کی کہ وہ بچوں کے اسکول میں پڑھائیں گی۔ پاپا نے اس بات کی مخالفت کی مگر امی تیار ہو گئیں کہ انکل سلیم کا جو اسکول ہے، اس میں تم پڑھا لینا۔

"مگر امی میں انکل سلیم والے اسکول میں نہیں بلکہ کسی ایسے اسکول میں پڑھانا چاہتی ہوں جہاں کے بچے غریب ہوں اور جنہیں صحیح تربیت دینے والے نہ ہوں۔"

"مگر تمہیں جب بچوں کو ہی پڑھانا ہے تو انکل سلیم کے اسکول میں پڑھاؤ۔ بچے تو سارے بچے ہی ہوتے ہیں نا!" امی نے تیزی سے کہا۔

"امی یہی بات تو میں کہہ رہی ہوں کہ بچے سارے بچے ہوتے ہیں جب باغ کے سارے پھول رنگین اور خوشبودار ہیں، سارے ستارے چمکتے ہیں، ساری تتلیاں ایک جیسی ہیں پھر یہ بچے کیوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بچے تو بچے ہی ہیں چاہے وہ امیر ہوں یا غریب۔"

آپا کی ان دلیلوں کے آگے امی پاپا کو کوئی جواب بن نہ پڑا اور بہت مجبوری کی حالت میں آپا کو اجازت مل گئی۔ آپا بہت خوش تھیں اور انہوں نے مجھے خوب ڈھیر ساری آئس کریم کھلائی۔

آج جب میں اسکول سے گھر آئی تو آپا ثمین گھر پر ہی تھیں۔ میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا "آپا میں بھی آپ کی طرح بنوں گی کیونکہ ہماری مس کہتی ہیں کہ ہماری آدھی سے زیادہ آبادی اَن پڑھ ہے۔ آپا میں سب کو پڑھاؤں گی۔" آپا نے مسکراتے ہوئے کہا "ننھی نہ پڑھنے یا نہ لکھنے سے جاہلیت نہیں ہوتی بلکہ اگر محبت ہوتے ہوئے بھی نفرت کی جائے،

دوستی ہوتے ہوئے بھی دشمنی کی جائے تو جاہلیت ہے۔ سو یہ ہمارے آدھے معاشرے میں نہیں بلکہ پورے معاشرے میں ہے، ہر گھر میں ہے۔"

"کیا ہمارے گھر میں بھی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ننھی ہمارے گھر میں بھی۔ اگر تم غور سے دیکھو اور سوچو تو....." آپا ثمین کی باتیں بڑی مشکل ہوتیں مگر پھر بھی مجھے بے حد اچھی لگتیں۔ میرا جی چاہتا میں گھنٹوں ان سے باتیں کروں۔

آج کل آپا بے حد اداس رہنے لگیں تھیں۔ میں نے پوچھا کہ آپا آپ کی خواہش تو پوری ہوگئی پھر آپ اداس کیوں ہیں؟ آپا نے بتایا اسکول کی حالت بہت خراب ہے بچوں کے پاس کتابیں ہیں نہ کپڑے بیٹھنے کے لئے ڈیسکیں ہیں نہ دریاں۔ ایسے اسکول کو کون اسکول کہہ سکتا ہے؟" یہ سن کر مجھے بھی بہت دکھ ہوا، اور میں سوچنے لگی کہ میرے اسکول میں تو یہ سب چیزیں ہیں پھر ان بچوں کے اسکول میں کیوں نہیں؟"

اب اکثر ہم دونوں کی گفتگو کا موضوع اسکول ہوتا۔ خاص کر آپا تو اس بات کے لئے بہت بے چین تھیں کہ وہ ان بچوں کے لئے کچھ کر سکیں مگر یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اتنے سارے بچوں کو کتابیں، کپڑے، بیگ اور دوسری چیزیں فراہم کرنا۔ اس وجہ سے وہ اور بھی اداس رہنے لگیں۔ آخر امی نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ اب تمہیں پڑھانے کی قطعی ضرورت نہیں، تمہاری صحت بہت خراب ہوگئی ہے، مگر امی کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ آپا کی صحت ان بچوں کے بارے میں سوچنے سے خراب ہوگئی ہے۔ آپا نے بہت ضد کی مگر اس مرتبہ امی نے جیسے اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ اب آپا کا سارا وقت گھر میں بیٹھے ان بچوں کے بارے میں سوچتے گزرتا۔ اب وہ مجھ سے بھی کم باتیں کرتیں اور ان کا گلاب کی طرح کھلا چہرہ خزاں کے پھول کی طرح کمہلا کر رہ گیا۔ میں نے بہت چاہا کہ امی پاپا کو اصل بات بتا دوں مگر امی پاپا اپنی دنیا میں مگن، ان تمام باتوں سے اس طرح ناآشنا تھے جیسے ہم ان کی بیٹیاں نہیں، شوکیس میں رکھی گڑیاں ہوں۔ بلکہ شوکیس کی گڑیوں کی بھی گرد صاف کی جاتی ہے مگر ہم پر اداسی، کرب اور مایوسی کی گرد نہ جانے کب سے پڑی تھی، اور اسے صاف کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپا اب اپنا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارتیں۔

آج صبح ہی سے تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور شام ڈھلنے سے پہلے ہی چاروں جانب اندھیرا پھیل گیا۔ آپا نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ امی پاپا تو اپنی مصروفیات میں مصروف تھے۔ بھلا انہیں گھر کی کیا خبر!...سو میں نے جلدی جلدی آپا کے لئے سینڈوچ اور چائے بنائی اور ان کے کمرے میں لے آئی۔ کمرے میں بہت خاموشی تھی اور اندھیرا بھی بہت تھا۔ آپا اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹی

تھیں۔ میں نے آہستہ سے ٹرے ان کے سرہانے رکھ دی اور اپنے ہاتھوں سے ان کا سر دبانے لگی۔ آپا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور مجھ سے کہنے لگیں کہ ننھی تمہیں پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ زندگی کیوں دی ہے؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا کہ تاکہ ہم یہاں خوش رہیں اور اللہ کی نعمتوں سے لطف اٹھائیں۔

"نہیں ننھی!" آپا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"اللہ نے یہ زندگی ہمیں اس لئے دی ہے کہ ہم اسے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے گزاریں۔ اس لئے کہ ہمیں مرنے کے بعد ایک اور دنیا میں بھی جانا ہے۔ جہاں ہمیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہوگا جو اچھے کام کریں گے وہ اپنا سر بلند کر کے چلیں گے اور جنہوں نے کوئی بھی اچھا کام نہ کیا ہوگا وہ سر جھکا کر چلیں گے، میری خواہش تھی کہ میں بچوں میں خوشیاں بانٹوں مگر میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔اب مجھے بھی اللہ اور اس کے رسول کے آگے سر جھکا کر چلنا پڑے گا!" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور ان کے ساتھ ہی بستر پر دراز ہوگئی۔ "آپا ابھی تو بہت سارے دن ہیں اور اللہ میاں کو تو یہ بھی پتا ہے ناکہ امی پاپا آپ کو اچھے کام نہیں کرنے دیتے تو اللہ میاں آپ کو ضرور معاف کر دے گا، ہے نا؟ اس پر آپا ثمین نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور اس کے بعد ہم دونوں خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

اس واقعہ کو ۲۰ سال گزر چکے ہیں۔ آپا ثمین کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی اتنا ہی عرصہ گزر چکا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ آپا ثمین اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں نے آپا ثمین کے خواب کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

اور آج ایک یتیم خانے میں نگراں کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہوں میرے ارد گرد چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میں ان سب کی خدمت کر کے بہت خوش رہتی ہوں۔ بہت ہی خوش۔ اور سچ جانیں کہ ہر بچے میں مجھے آپا ثمین کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔

ایک دعا

میری تو یہ دعا ہے کہ جس طرح یا اللہ! تو نے افغانستان کے مسلمانوں کو آزادی، مسلم ممالک کے ذریعے دلوائی ہے، جس میں پاکستان پیش پیش رہا ہے، اسی طرح کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزادی دے اور پاکستان کا حصہ بنا دے (آمین)

(س، م، ذیشان، کراچی)

نسل در نسل صحت مند اور
خوش وخرم بچے
مائیں جانتی ہیں کہ بچے اسی وقت خوش وخرم رہتے ہیں جب وہ صحت منداور مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۱۴۰ سال سے سمجھدار مائیں اپنے بچوں کو وڈورڈ گرائپ واٹر پلارہی ہیں۔ اسی لئے ریاحی درد، ہاضمے کی خرابی یا دانت نکلتے وقت مسوڑھوں کی تکلیف میں آپ بھی اپنے بچے کو وڈورڈ گرائپ واٹر دیجیے۔ وڈورڈ گرائپ واٹر ہی بچوں کو تکلیف میں راحت پہنچاتا ہے۔
WOODWARD
بچوں کی صحت وڈورڈ کی روایت
WOODWARD

Interflow

ننھے تارے

وُڈ ورڈز
بے بی مقابل

نورالعین لاکھانی ـــــــــ کراچی

مدیحہ اعجاز ـــــــــ گجرات

فرنیب ـــــــــ بلوچستان

سدرہ بیگ ـــــــــ کراچی

سنگدل

شگفتہ شمیم

آج جب ہمارے زولوجی کے پروفیسر نے بتایا کہ دنیا سے اچھی اور خوبصورت نسل کی تتلیوں کا بڑی تیزی سے خاتمہ ہو رہا ہے جن کا شکار ماضی میں بھی لوگوں نے محض تفریح کی خاطر کیا اور آج بھی لوگ اس احمقانہ شوق میں مبتلا ہیں تو مجھے اپنے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک ایسا عام سا واقعہ جسے لوگ یاد رکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ آج پروفیسر صاحب کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ واقعات عام یا خاص نہیں ہوتے بلکہ یہ صرف انسان کا ضمیر ہے جو اسے ان کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

ان دنوں میں دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ مس آغا ہمارے اسکول کے پرائمری سیکشن کی واحد انگریزی کی استاد تھیں۔ انھیں اپنی اہمیت کا بہت احساس تھا جس کا اظہار پڑھائی کے دوران بھی اکثر کرتی رہتی تھیں۔ اسکول کے زیادہ

ظلم کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر روز ایک مسلمان کو سومنات کے بت کے چرنوں میں ذبح کیا جاتا تھا لیکن چند مؤرخ لکھتے ہیں کہ ہر روز نہیں بلکہ ہر چاند کی یکم تاریخ کو ایک مسلمان کو ذبح کر کے اس کے خون سے بت کو غسل دیا جاتا تھا۔ یہ سراغ کہیں سے بھی نہیں ملتا کہ سومنات کا مندر کب تعمیر ہوا اور کس نے اس کو تعمیر کیا تھا۔

سوم کے معنی "چاند" اور نات یا ناتھ کے معنی آقا کے ہیں یعنی سومنات یا سومناتھ کا مطلب "چاند کا آقا ہے" یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سمندر میں چاند کے مطابق مدوجزر پیدا ہوتا ہے سمندر کا پانی ساحل کی طرف لپکتا ہے اور موجیں ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ سومنات کا مندر چونکہ سمندر کے کنارے پر واقع تھا اس لئے موجیں مندر کی دیوار سے ٹکراتی رہتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ پانی مندر کی دیواروں کو دھو رہا ہے۔ پنڈتوں نے ہندوؤں کے دلوں میں یہ بات ڈالی دی تھی کہ چاند دیوتا اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے اپنے آقا یعنی سومنات کے پاؤں دھوتا رہتا ہے۔ سومنات کا بت باقاعدہ تراشا ہوا نہیں تھا۔ یہ ایک قدرتی طور پر گول اور لمبوتری چٹان تھی جس کی شکل انسانوں جیسی تھی۔ یہ تین گز زمین سے باہر اور دو گز زمین کے اندر تھی اس کی موٹائی ڈیڑھ گز تھی۔ ہندوستان کے تمام بت اس کے غلام تھے۔ ہندوؤں کا اس کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ تھا کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی روح سومنات میں آجاتی ہے اور یہاں سے اس کو دوبارہ جنم ملتا ہے (یہ عقیدہ آج بھی مانا جاتا ہے) سومنات کا مندر فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ اس کی بنیادیں سمندری چٹانوں کو تراش کر بنائی گئی تھیں اس کے چھپن (۵۶) ستون تھے جو ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ بت میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ بت کے کمرے میں سونے کی ایک زنجیر تھی جس کا وزن دو سو من تھا۔ اس زنجیر کے ساتھ ایک گھنٹی بندھی ہوئی تھی جو خاص خاص موقعوں پر بجائی جاتی تھی۔ دس (۱۰) ہزار پنڈت باری باری ہر لمحہ بت کی پوجا کرتے رہتے تھے۔

۱۰۲۵ء تک سلطان محمود غزنوی کو سومنات کے مندر کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک دن سلطان اپنے محل میں آرام فرما رہے تھے کہ انہیں دربان نے آکر اطلاع دی کہ ہندوستان سے ایک جاسوس آیا ہے۔ سلطان نے اسے فوراً اپنے پاس بلایا جاسوس نے سلطان کو سومنات کے مندر کے متعلق سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں مسلمانوں پر کتنا ظلم و ستم ہو رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے تمام تفصیلات سننے کے بعد اسی وقت سومنات پر فوج کشی کا ارادہ کر لیا اس نے فوراً اپنے سپہ سالار ابو عبداللہ محمد الطائی کو بلا لیا۔ سلطان نے ہندوستان کا نقشہ اپنے سامنے پھیلا لیا اور دونوں اس پر جھک کر کافی دیر تک منصوبے بناتے رہے۔ سلطان محمود نے ۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء مطابق ۲۲ شعبان ۴۱۶ھ ہجری کو غزنی

سے کوچ کیا۔ کسی بھی مورخ، وقائع نگار اور مبصر نے سلطان محمود کی فوج کی تعداد نہیں لکھی۔ البتہ ہر ایک نے تین ہزار گھوڑ سوار لکھے ہیں۔ سلطان محمود نے لاہور کے بجائے ملتان کا رخ کیا۔ اتنی بڑی فوج دیکھ کر ملتان کے لوگ حیران رہ گئے کہ سلطان اتنی بڑی فوج کس لئے لایا ہے؟ سلطان محمود نے فوراً ملتان میں اپنے مشیروں کو اکٹھا کیا اور ان سے سومنات کے متعلق مزید معلومات مہیا کرنے کے لئے کہا اور حکم دیا کہ فوج کی آمد کو ہندوؤں سے پوشیدہ رکھا جائے لیکن اتنی بڑی فوج کی آمد کو پوشیدہ رکھنا ناممکن تھا اس لئے ہندوؤں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ سلطان محمود سومنات پر فوج کشی کے لئے جا رہا ہے۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے اسی وقت در پردہ قاصد دوڑا دیئے۔ ان کے قاصد ان چھوٹے چھوٹے راجوں اور مہاراجوں تک پہنچے جن کے ساتھ ابھی سلطان محمود کی ٹکر نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے سومنات کو بھی قاصد دوڑا دیئے کہ مہاراج کنور رائے کو خبر دار کر دیں اور وہ غزنی کی فوج کو سومنات سے دور ہی روک لے۔ سلطان محمود کو بھی پورا احساس تھا کہ سومنات کا مندر دوسرے مندروں جیسا نہیں بلکہ یہ ہندوؤں کے نزدیک اتنا ہی مقدس ہے جتنا کہ مسلمانوں کے نزدیک خانہ کعبہ۔ اس لئے وہ جنگ کی تیاریاں وسیع پیمانے پر کر رہا تھا۔

۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء عیدالفطر کے دو روز بعد سلطان محمود نے ملتان سے کوچ کا حکم دیا۔ عیدالفطر کی نماز کے بعد اس نے اپنی فوج سے مختصر سا ایک خطاب کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ "ہم ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جو ہماری زندگی کا سب سے کڑا امتحان ہے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ سلطان تباہ ہونے کے لئے سومنات جا رہے ہیں آپ کو اب جو بت توڑنا ہے اسے ہندو طاقت کا دیوتا خیال کرتے ہیں لیکن آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ طاقت صرف اللہ کے پاس ہے۔ پتھر کا بت ٹوٹنے میں سخت ہو سکتا ہے طاقتور نہیں ہو سکتا آپ کو ہندوؤں کے اس عقیدے کو غلط ثابت کرنا ہے۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ فوج کو ایسی ترتیب سے کوچ کرایا گیا کہ سب سے آگے والے آدمی اور سب سے پیچھے والے آدمی کے درمیان ایک سو میل کا فاصلہ تھا۔ فوج ایسے صحرا میں داخل ہو گئی جس کے متعلق سلطان محمود نے معلومات لے لی تھیں مگر صحرا میں اور آگے جا کر اسے احساس ہوا کہ اس کو آٹے میں نمک کے برابر معلومات مہیا کی گئیں تھیں۔ دسمبر کے آخر میں ایک ماہ صحرا میں گزار کر سلطان محمود پتن یا ہزوالہ کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ہندوؤں کی کم و بیش بیس (۲۰) ہزار فوج نے سلطان کا راستہ روک لیا کیوں کہ وہ سلطان کے ارادوں سے واقف تھے۔ اس لئے وہ سومنات کو بچانے کے لئے بے جگری سے لڑے مگر کامیابی نہ ہوئی اور پسپا ہو گئے۔ لیکن اس سے سلطان کو بھی

خاصا نقصان پہنچا۔ سلطان محمود ٦ جنوری ١٠٢٦ء مطابق ١٤ ذی القعد ٤١٦ ہجری بروز جمعرات سومنات کے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اسے اپنی فوج اکٹھی کر کے سومنات کو محاصرے میں لینا تھا مگر دشمن اسے سومنات کے باہر ہی روکنے کے لئے تیار تھا۔ سلطان محمود نے کچھ اپنے مشاہدے اور زیادہ تر جاسوسوں کے ذریعے دشمن کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ سومنات کا شہر قلعے کے اندر تھا اور یہ بہت بڑا اور مضبوط شہر تھا۔ اس کے تین اطراف سمندر تھا اور سامنے ایک وسیع اور گہری خندق تھی۔ جب شہر کا محاصرہ کیا گیا تو ہندو شہری اور فوجی شہر کی دیواروں پر اپنی تیر کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ وہ غزنی کی فوج کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ "مسلمانو! تم یہاں تباہ ہونے کے لئے آ گئے ہو۔ سومنات تم سے اپنی توہین کا انتقام لے گا۔" مندر کی مسلسل گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دس ہزار پنڈت پوجا پاٹ کر رہے تھے اور بھجن گا رہے تھے۔ سومنات کا مہاراجہ کنور رائے قلعے کی دیواروں پر، گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر فوج، اور شہریوں کو جوش دلا رہا تھا۔ کسی جگہ کا راجہ پرم دیو اپنی فوج اور اپنا خزانہ لے کر آ گیا تھا۔ سلطان محمود نے ہندوؤں کا یہ جوش و خروش دیکھا تو گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ وہ شہر کو جلد از جلد فتح کرنے کی اسکیم بنانے لگا۔ اس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ "اس کو عام سی جنگ نہ سمجھ لینا بلکہ یہ اسلام اور ایک باطل مذہب کی جنگ ہوگی۔ اس میں تم کو یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے اور اللہ ہی سب کا مالک و خالق ہے۔" اس نے کہا کہ کل جمعتہ المبارک ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے محاصرہ مکمل ہو جانا چاہئے لیکن محاصرہ تمام شہر کا نہیں ہو سکے گا کیوں کہ شہر کے تینوں اطراف سمندر ہے سامنے گہری خندق ہے۔ آپ کو قلعہ پر دھاوا بولنا پڑے گا۔ ہندو قلعہ کی دیواروں اور برجوں پر تیروں کا مینہ برسا رکھیں گے۔ سیڑھیاں تیار ہو چکی ہیں ان سے

سیلز مین

○...... ایک نوجوان لڑکا ایک کمپنی کے منیجر سے یوں مخاطب ہوا۔

"کیا آپ کو ایک اچھے کلرک کی ضرورت ہے؟"

منیجر...... "نہیں"

امیدوار...... "مستری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

منیجر...... "معاف کرو بھائی ہمیں اپنے عملے میں اضافہ نہیں کرنا۔"

نوجوان نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک سائن بورڈ نکالتے ہوئے کہا "تب تو یقیناً آپ کو اس بورڈ کی ضرورت ہوگی۔ جس پر لکھا تھا "کوئی جگہ خالی نہیں۔"

"اور اس کی قیمت صرف بیس روپے ہے" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

اقوال دانائے اہل فرنگ

○ خاموشی گفتگو کا بڑا فن ہے۔ (ہیزلٹ)
○ ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو اوروں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ (سنیکا)
○ آپ اپنے متعلق خود کچھ نہ کہیں یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہوگا۔ (ایڈیسن)
○ برے کام کرنے سے جو ڈرے وہ سب سے بہادر ہے۔ (کارلائل)
○ امیدوں کے سہارے جینا خود کو دھوکہ دینا ہے۔ (بٹلر)
○ بڑھاپا زندگی کی مسرتوں کو کم لیکن زندگی کی ہوس کو زیادہ کر دیتا ہے۔ (گولڈ اسمتھ)
○ بحث گفتگو کی موت ہے۔ (بارلم)
○ انسان کا بہترین مطالعہ انسان کا مطالعہ ہے۔ (باسفورتھ)

(قیصر محمود قیاسی۔ مانسہرہ)

تھیں "مسلمان کو موت یہاں لے آئی ہے بھارت ماتا میں کوئی مسلمان زندہ نہیں رہے گا۔ شو دیو کے پجاریو! مسلمانوں کی بوٹیاں سمندر میں بہادو خبردار ہوشیار! جو لڑتا ہوا مارا جائے گا اس کو شو دیو دوسرا جنم دیں گے۔"

جمعہ کے دن غزنی کی فوج میں اذان کی مقدس آواز گونجی۔ تمام فوج نے با جماعت نماز ادا کی سلطان محمود بھی فوج کی کسی صف میں کھڑا تھا۔ نماز کے بعد امام نے بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر فتح کی دعا کی اور فوراً ہی فوج نے سومنات کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کے حکم پر فوج نے بلہ بول دیا، ہندو قلعے کی دیواروں سے تیروں کا مینہ برسا رہے تھے اور بہت بہادری سے لڑ رہے تھے سلطان محمود نے دیکھا کہ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی ہے تو وہ گھوڑے سے کود کر اترا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل پڑھے۔ پھر دعا مانگی سالار ابوالحسن کا جو اس کے قریب کھڑا تھا، ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "ابوالحسن! فتح ہماری ہے" اس نے سالار کو گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا۔ خود بھی سوار ہوا۔ اس نے اپنا علم اونچا کرنے کو کہا اور سپاہیوں کی طرح میدانِ جنگ میں شامل ہو گیا ہر طرف اعلان ہونے لگے "سلطان خود لڑ رہے ہیں غزنی کے مجاہدو! سلطان تمہارے ساتھ ہے۔" اس سے فوج میں اور جوش و خروش بڑھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اس جنگ میں جو ہندو فوجی مارے گئے ان کی تعداد

دیواروں پر چڑھا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خودکشی کی کوشش ہوگی لیکن قلعہ بند شہر فتح کرنے کو پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ غزنی کو کچا چبا جانے کا عہد کر چکے تھے اور انہوں نے یہ عہد شو دیو کے بت کے قدموں میں ماتھا رکھ کر کیا تھا۔ کوئی ہندو نہتا نہیں تھا وہ تلواروں، برچھوں ترکشوں اور کمانوں سے مسلح تھے۔ سومنات کی گلیوں میں وہ خبریں جو شہر کی دیواروں کے اوپر سے آئی تھیں، اعلان کے انداز میں سارے شہر کو سنائی دے رہی تھیں اور بہت سی آوازیں گھٹاؤں کی طرح گرج رہی

تقریباً پچپن ہزار (۵۵۰۰۰) تھی۔ سمندر کے راستے جو فوجی بھاگ گئے تھے۔ ان کی تعداد پانچ ہزار تھی اور یوں سومنات کا مندر سلطان محمود کے قدموں میں پڑا تھا۔ یہ ۱۰ جنوری ۱۰۲۶ء کا واقعہ ہے اور دن پیر کا تھا۔ سلطان محمود جب مندر میں داخل ہوا تو بے اختیار اس کے ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں اٹھ گئے۔ سلطان نے جب مندر کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مندر کی سیڑھیوں پر دس ہزار (۱۰۰۰۰) پنڈتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ ان کے درمیان میں سب سے بڑا پنڈت تھا۔ سب نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ سلطان محمود کے متعلق مختلف تاریخوں میں آیا ہے کہ وہ پنڈتوں اور پجاریوں کو کچھ نہیں کہا کرتا تھا اس لئے اس نے ان پنڈتوں سے کہا کہ وہ ہاتھ نیچے کر لیں کیوں کہ اسلام میں سب انسان برابر ہیں۔ سلطان سیڑھیوں پر چڑھ گیا یہ فتح اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اس نے اپنے ایک محافظ سے جنگی کلہاڑا لیا اور اس چبوترے پر چڑھ کر جس پر شودیو کا بت کھڑا تھا کلہاڑے سے بت کی ناک توڑ دی اور حکم دیا کہ اس بت کو توڑ دیا جائے اس پر بڑے پنڈت اور دوسرے پنڈتوں نے سلطان کے قدموں میں گر کر التجا کی کہ بت کو نہ توڑا جائے! وہ اس کو سومنات کی تمام دولت دے دیں گے۔ لیکن اس پر سلطان نے جو جواب دیا وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ سلطان نے کہا کہ "میں بت فروش نہیں بت شکن کہلانا چاہتا ہوں"

گردیزی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے کہا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ یوں پکارے کہ کہاں ہے وہ محمود جس نے ہندوستان کے بت کدے کا سب بڑا بت توڑا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ لاؤ ہمارے سامنے غزنی کے اس محمود کو جس نے زر و جواہرات کے عوض بت پرستوں کو بت بخش دیا تھا۔" سلطان نے حکم دیا "اس بت کے دو ٹکڑے غزنی جائیں گے۔ ایک میرے گھر کے باہر دروازے میں رکھا جائے گا اور دوسرا غزنی کی جامع مسجد کے دروازے کے باہر جہاں پر ہر کسی کے پاؤں تلے آئے۔ اس کا ایک ٹکڑا مدینہ منورہ اور دوسرا مکہ معظمہ بھیج دیا جائے" محمد قاسم فرشتہ اور دوسرے بہت سے مورخوں نے لکھا ہے کہ آج بھی اس بت کا ایک ٹکڑا غزنی میں سلطان کے محل کے بیرونی دروازے میں، دوسرا جامع مسجد کے دروازے میں تیسرا مدینہ منورہ اور چوتھا مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ مندر کی عمارت کے ستون ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ سلطان محمود نے شودیو کا بت تڑوا کر باہر پھینکوا دیا اور مندر سے تمام خزانہ نکال کر ستونوں کو آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد برصغیر کا سب سے بڑا بت خانہ جس میں "چاند کے آقا" کا بت تھا اور جس میں مرے ہوئے انسانوں کی روحیں جمع ہوتی تھیں اور جو، ان روحوں کو دوسرا جنم دیا کرتا تھا ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سے زمین بوس ہو کر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

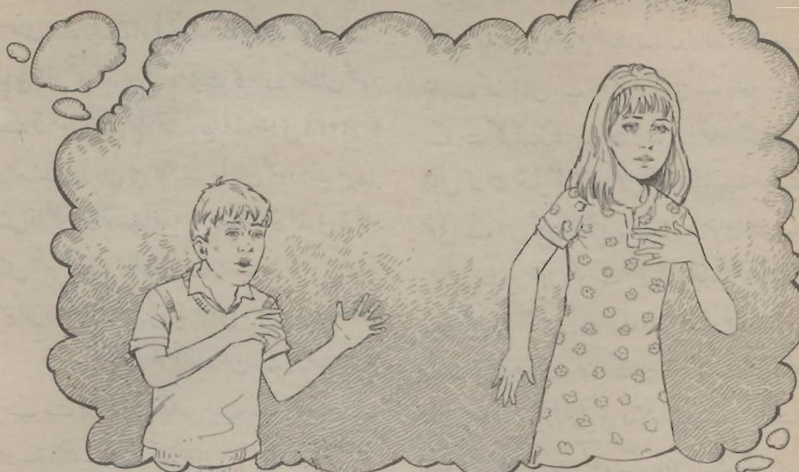

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی

عبدالقادر

بھائی
فوٹو میں مرے آپ نے کیوں مونچھ بنائی؟
پھر آپ نے تصویر سہیلی کو بتائی!

بھائی نہیں سمجھا ہے مجھے آپ نے اب تک
یہ آپ کا برتاؤ مجھے سہنا ہے کب تک؟

بہن
اے بھائی مرے، آپ کا یہ کیسا گلہ ہے!
نوچے تھے مرے بال، اُسی کا یہ صلہ ہے

بھائی نہ سمجھتی تو مزا خوب چکھاتی
جو آگ تھی غصے کی، سزا دے کے بجھاتی

بھائی
دھکا مجھے دہلیز پہ تم نے ہی دیا تھا
تم نے ہی مرا پیارا قلم چھین لیا تھا

کہہ دوں جو کھری بات تو یاد آئے گی نانی
دانائی نہیں نام کو، بنتی ہو سیانی

بہن
بکواس مہینوں سے یہی سنتی رہی میں
نشتر جو لگائے ہیں انہیں سہتی رہی میں

تعظیم مری تم نے کبھی کی ہی نہیں ہے
خوبی مری تسلیم کوئی کی ہی نہیں ہے

بھائی
میں تجھ کو سمجھتا نہیں تعظیم کے قابل
خوبی تو ذرا سی نہیں، اخلاق میں شامل

طاقت سے مرے ہاتھ کو تو نے ہی مروڑا
یہ میری شرافت ہے ترا سر نہیں توڑا

بہن چہرے سے برستی ہے سدا تیرے حماقت
اسکول میں کہتے ہیں سبھی تجھ کو "پھسڈی"
اک ذرہ برابر بھی نہیں تجھ میں لیاقت
مطلب نہیں تعلیم سے پیاری ہے کبڈی
بھائی الزام لگاتی ہے، بڑی بنتی ہے بھولی!
کیا پیارا نہیں کھیل تجھے آنکھ مچولی؟
ہاں تو ہے لڑاکا تجھے پہچان گیا ہوں
جو مجھ سے عداوت ہے اسے جان گیا ہوں
بہن کہتا ہے لڑاکا مجھے گستاخ کہیں کا
ماروں گی ترے گال پہ اک زور سے چانٹا
کینے سے بھرا ہوتا ہے بس تیرا ہی سینہ
الٹا مجھے الزام بھی دیتا ہے کمینہ
بھائی انجام بُرا ہوگا جو آجائے مجھے تاؤ
میں تجھ کو بتاؤں گا کراٹے کے ذرا داؤ
اک دوں گا پٹخنی تو نظر آئیں گے تارے
گھونسے سے ترے دانت اکھڑ جائیں گے سارے
بہن چل چل بڑا آیا ہے یہاں دھونس جمانے
گھبراتا ہے چوہوں سے، چلا مجھ کو ڈرانے
اک لات میں آئیں گے ترے ہوش ٹھکانے
تجھ پر مری پھٹکار ہے منہ زور دیوانے

(ماں کمرے میں آتی ہے)

ماں پھر تم نے شروع کی ہے یہاں آج لڑائی
رہتے ہی نہیں چین سے کیا دل میں سمائی
میدان لڑائی کا اسی گھر کو بنایا
بیکار سی باتوں میں سدا وقت گنوایا
کرتی رہی تاکید تمھیں اس کی برابر
نقصان تمھارا ہے لڑائی سے سراسر
ہے دین کا پیغام محبت سے رہو تم
غصہ نہ کرو اور عداوت سے بچو تم

پھل دینے والا درخت

رؤف اسلم آرائیں

ناصر روز روز کی مار کا عادی سا ہو گیا تھا۔ نہ تو اسے اب فرزانہ باجی کی ڈانٹ کی فکر تھی نہ جاوید بھائی کی چمکیلی چھڑی کی۔ اور تو اور اسکول میں بھی وہ بڑے دھڑلے سے گھومتا۔ ماسٹر غفور کی سزا پہلے دن تک تو اثر کرتی تھی مگر دوسرے اور تیسرے دن ناصر پھر سے اپنے اصل روپ میں آجاتا۔ پھر وہی سزائیں ہوتیں اور ناصر ہوتا۔ کبھی احتشام کا بستہ کرسی کے پائیدان سے بندھا ہوتا تو کبھی اشتیاق کے پیچھے لمبی سی دُم بندھی ہوتی۔ کبھی صادق کا کارٹون بلیک بورڈ پہ بنا ہوتا تو کبھی کاشف کے پیچھے ”گدھا برائے فروخت“ کی پٹی لگی ہوتی۔

ناصر کی کتنی ہی شکایتیں ہوئیں۔ کتنی بار اس کی پٹائی ہوئی مگر اس پہ کوئی اثر نہ ہوتا۔ ہر کام کو ٹالنا اور ٹال کر بھول جانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ بس اس کا دل چاہتا تھا وہ تمام دن کھیلتا رہے، بھوک لگے تو کھانا کھالے اور نیند آئے تو سو جائے۔

فرزانہ باجی نے اسے اتنی بار سمجھایا، اسے لالچ دیئے مگر وہ سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا۔ "افوہ...... ! بھئی آپ لوگ کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔"

"ناصر!" فرزانہ باجی کہتی۔ "ہر کام کا ایک وقت متعین ہے۔ تم جتنا کھیلتے ہو اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر تو پڑھ لیا کرو۔ یہ کھیل تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔"

"میں آپ کی بات نہیں مانتا!" ناصر تنک کر کہتا۔ "جاوید میاں داد نے شارجہ میں ایک چھکا لگایا تو اس کو ہزاروں روپے ملے تھے۔ عمران خان کوئی میچ جیت جائے تو کتنے میڈل اسے ملتے ہیں۔ آپ میچ دیکھیں تو آپ کو پتا چلے کھیل کے کتنے فائدے ہیں۔"

فرزانہ باجی پھر کہتیں۔ "مگر ناصر! جاوید میاں داد اور عمران خان کی زندگی کے بارے میں تم نہیں جانتے۔ انہوں نے پڑھائی اور کھیل کا ایک وقت متعین کیا ہوا تھا اگر یہ لوگ پڑھے لکھے نہ ہوتے تو بھلا اتنی فرفر انگریزی کس طرح بولتے۔"

بس یہیں پر آکر ناصر ہار جاتا۔ تب وہ سوچتا واقعی ضرور انہوں نے خوب محنت کی ہوگی جبھی تو اتنے ذہین ہیں، مگر یہ بات سوچتے ہی وہ ایک بار پھر سب کچھ فراموش کر دیتا۔

ان دنوں اس کے امتحان نزدیک تھے تمام سال کھیل کود میں ضائع کرنے کے بعد اسے اب احساس ہو رہا تھا اگر وہ روز ایک سوال بھی یاد کر لیتا تو آخری دنوں میں اسے ایک ایک کتاب پہاڑ نہ معلوم ہوتی۔ اس نے جیسے تیسے رٹے لگائے اور امتحان میں شریک ہوا۔

چند ہی دنوں میں وہ امتحانوں کے اذیت ناک لمحوں سے بھی فراغت پا چکا تھا۔ اب وہی گلیاں تھی اور وہی اس کے شرارتی دوست۔ اسے اپنے نتائج کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ہاں وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ نمبر چاہے جیسے بھی آئیں، پاس ضرور ہو جاؤں گا۔

خیر وہی ہوا۔ جس روز اسکولوں میں نتائج نکلنا تھے پورے اسکول میں بے پناہ رش تھا۔ والدین اپنے اپنے بچوں کے نتائج سننے کے لئے بے چین تھے۔ جنھوں نے محنت سے سارا سال پڑھا تھا ان کے چہرے پہ اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے دکھائی دیتے اور جن کے

تصویر بناتا ہوں

باپ...... (بیٹے سے) "کیا کر رہے ہو؟"
بیٹا...... "تصویر بنا رہا ہوں۔"
باپ...... (حیرت سے دیکھتے ہوئے) "کس چیز کی تصویر بنا رہے ہو؟"
بیٹا...... "گائے گھاس چر رہی ہے۔"
باپ...... "گھاس کہاں ہے؟"
بیٹا...... "وہ گائے کھا گئی۔"
باپ...... "اور گائے کہاں ہے؟"
بیٹا...... "وہ گھاس کھا کے چلی گئی۔"
(مرسلہ...... شاہ زیب محمود، کراچی)

سال کھیلوں کے میدانوں میں صرف ہوئے تھے، ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کلاس روم میں وہ بوکھلائے سے پھر رہے تھے۔ پوچھا کچھ جاتا جواب کچھ دیتے۔ سوال گندم اور جواب چنا والا معاملہ تھا۔

میر غنی صاحب نے نتائج پڑھنا شروع کئے۔ پورے اسکول میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ صرف ماسٹر غنی صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔

پورے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر اسد کے آئے تھے۔ تالیوں کا بے پناہ شور گونجا اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے گئے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ کی طرف سے بھی اسے کئی انعامات دیئے گئے ہر کوئی اسے مبارک باد دے رہا تھا۔

پھر بالترتیب دوسرے لڑکوں کے نام پکارے گئے۔ تمام کامیاب لڑکوں کے لئے دیر تک تالیاں بجتی رہیں بالآخر نتائج اپنے اختتام کو پہنچے۔ ناصر کو ایک جھٹکا لگا اُس کا نام تو پاس ہونے والوں میں بھی شامل نہیں تھا۔ ناصر نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا، فرزانہ باجی بھی ساتھ ہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے اسے کچھ نہ کہا۔ ناصر نے دونوں کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو دیکھ لیا۔ امی نے نہ تو اس کا ماتھا چوما نہ فرزانہ باجی نے اس کے بھرے بھرے گالوں پر پیار کیا۔ بس انھوں نے ایک نظر اسے دیکھا اور اسکول کے احاطے سے باہر نکل گئیں۔

پورا اسکول لوگوں سے بھرا ہوا تھا مگر امی اور فرزانہ باجی کے جاتے ہی ناصر کو یوں محسوس ہوا جیسے پورا اسکول خالی ہوگیا ہو۔ وہ سب سے آخر میں خالی سیٹ دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ تمام بچے اپنے والدین کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور پھر سب خاموش ہوگئے۔ ہیڈ ماسٹر قدرت اللہ صاحب تقریر کر رہے تھے۔ سب ہمہ تن گوش ہو کر ان کی تقریر سن رہے تھے۔ بس ایک ناصر ایسا تھا جو سب سے بے گانہ تھا اور مسلسل یہی سوچ رہا تھا کاش اسے بھی کوئی پیار کرے، سینے سے لگائے اور مبارکباد دے مگر مبارکباد کیسی؟ وہ تو بڑی طرح ناکام ہوگیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے۔

"کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بچے کامیاب ہوئے انہیں بہت بہت مبارک باد۔ بس میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے، پھل دینے والے درختوں کی ہر کوئی حفاظت کرتا ہے، آپ سب بھی اپنے والدین کے مضبوط اور تناور درختوں کی مانند ہیں۔ پڑھئے اور خوب پڑھئے، بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب یہ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ ناصر بس صرف اس جملے پر چونکا تھا۔ اسکول میں سب گہما گہمی بدستور تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اسکول خالی ہونے لگا۔ بچے خوشی خوشی اپنے والدین کے ساتھ اسکول سے گھروں کی جانب لوٹنے لگے۔

"ارے......! تم اب تک یہاں بیٹھے ہو، پورا اسکول خالی ہوچکا ہے۔" چوکیدار نے اچانک ناصر کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ناصر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا......؟ گھر نہیں جانا......" اس نے پھر ناصر کو مخاطب کیا۔

ناصر نے ایک نظر چوکیدار پر ڈالی اور پھر کچھ کہے بغیر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ہوا اسکول سے باہر نکل گیا۔

گلی کی رونقیں اپنے جوبن پہ تھیں۔

"آؤ...... آؤ" ......! ناصر کو آتا دیکھ کر اس کے دوست دور ہی سے چلاّئے "دیکھو......! تمہارے انتظار میں ہم نے اب تک بیٹنگ ٹاس بھی نہیں کیا۔" عدنان نے ناصر کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ناصر اب بھی خاموش رہا۔ ہاں آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو وہ کسی سے نہ چھپا سکا۔

"ارے ارے!" لڑکے حیران سے ہو کر اسے گھورنے لگے۔ ناصر نے وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا، شام ہو گئی تھی۔ وہ نہ معلوم کب تک اپنے کمرے میں بند تکیے میں منہ دیئے روتا رہا۔ نہ تو امی کمرے میں آئیں نہ بھیا۔ فرزانہ باجی تو پہلے ہی اپنی سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا شاید اب امی آئیں اسے پیار کریں۔ شاید فرزانہ باجی ہی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے اندر داخل ہوں اور زبردستی اس سے پورا گلاس خالی کرائیں مگر آٹھ بج گئے کوئی نہ آیا۔ تب اسے ہیڈ ماسٹر صاحب کا وہ جملہ یاد آنے لگا جو انہوں نے اسکول کی تقریر کے دوران کہا تھا۔ "پھل دینے والے درختوں کی ہر کوئی حفاظت کرتا ہے۔ آپ سب بھی اپنے اپنے والدین کے تناور درخت ہیں، پڑھئے اور خوب پڑھئے۔"

ناصر سوچنے لگا "واقعی میں تو کچھ بھی نہیں پھر میرا کون خیال رکھے گا۔ مجھے اپنی حفاظت کروانے کے لئے پھل دار درخت بننا پڑے گا اور میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔"

اس نے اٹل لہجے میں اچانک ایک فیصلہ کر لیا۔ پھر اس نے الماری میں بند کتابوں کی گرد جھاڑی اور لائٹ جلا کر پڑھنے لگا۔

اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہونے لگا تھا۔ گھڑیال سرکتے سرکتے دو کے ہندسے پر آکر چلایا۔ ناصر نے بے نیازی سے اسے دیکھا اور پھر سے کتاب میں گم ہو گیا۔ اسی وقت دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا، ناصر نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ فرزانہ باجی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے کھڑی تھیں...... قدموں کی ایک اور دھمک گونجی، امی ابو اور بھائی جان بھی اندر آچکے تھے۔

یہ لو چندا...... دودھ پی لو......؟ فرزانہ باجی نے دھیرے سے کہا۔

علم سب کیلئے کیوں نہیں؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ:

○ پاکستان میں ایک کروڑ سے زیادہ بچے تعلیم و تدریس سے محروم ہیں۔

○ سرکاری دعویٰ کے مطابق ملک میں صرف ۳۴ فیصد افراد "خواندہ" ہیں۔

○ ملک میں تعلیم یافتہ افراد ۱۰ فیصد سے کم ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ:

۲۱ویں صدی میں قدم رکھتے وقت ہر پاکستانی بچہ اسکول جارہا ہو

اگر آپ کی بھی یہی خواہش ہے کہ وطن سے جہالت کے اندھیرے دور ہوں تو
اس جدوجہد میں انڈپینڈینٹ لٹریسی مومنٹ کا ساتھ دیجئے۔

خواندگی کے عالمی دن کے حوالے سے وزیراعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف کو خط لکھئے کہ:

○ پرائمری تعلیم مفت اور لازمی قرار دی جائے۔

○ اس فیصلے کو آئینی تحفظ فراہم کیا جائے۔

انڈیپینڈینٹ لٹریسی موومنٹ
ILM
Independent Literacy Movement

POST BOX NO: 11002, KARACHI 75230 PAKISTAN

مفاد عامہ میں اس جریدے نے یہ پیغام بلامعاوضہ شائع کیا ہے

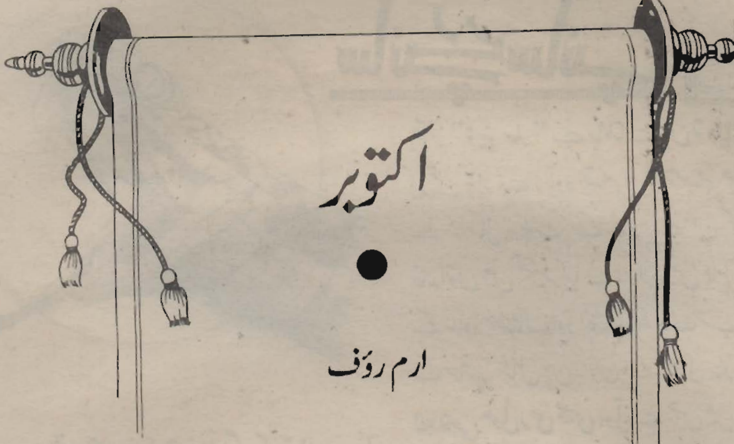

اکتوبر

ارم رؤف

اکتوبر انگریزی کیلنڈر کا دسواں مہینہ ہے۔ اس میں ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ انگریزی کیلنڈر کے اکثر مہینے کسی دیوی، دیوتا یا کسی یونانی شخصیت کے ناموں سے منسوب ہوتے ہیں لیکن اکتوبر کا نام کسی سے منسوب نہیں۔ یہ لاطینی لفظ اوکٹو سے نکلا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں آٹھ۔ شروع شروع میں کیلنڈر کی ابتدا مارچ کے مہینے سے ہوا کرتی تھی۔ اکتوبر سال کا آٹھواں مہینہ ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام اوکٹو سے اکتوبر پڑ گیا۔ موجودہ کیلنڈر گرے گورین کیلنڈر کہلاتا ہے۔ اکتوبر کے مہینے کا اس موجودہ کیلنڈر سے بھی گہرا تعلق ہے۔ وہ اس طرح کہ سولھویں صدی عیسوی میں ماہرینِ تقویم کو اس بات کا علم ہوا کہ بعض وجوہ کی بنا پر کیلنڈر میں دس دن کا فرق پڑ چکا ہے تو انہوں نے اس وقت کے شہنشاہ کے حکم سے اس میں سے دس دن ختم کر دیئے۔ اس طرح ۵ اکتوبر ۱۵۸۲ء کے بعد آنے والی تاریخ ۱۶ اکتوبر ۱۵۸۲ء قرار دی گئی۔ اسی موقع پر لیپ کے سال کے قانون بھی وضع ہوئے۔

اکتوبر کے مہینے میں دنیا میں اور پاکستان میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ کئی مشہور افراد اسی مہینے میں پیدا ہوئے۔ کئی نے وفات پائی اور کئی اہم شخصیات اسی ماہ میں قتل ہوئیں۔ اکتوبر کے مہینے میں واقعۂ کربلا پیش آیا۔ اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا، پہلا خلائی جہاز اسپوتنک اوّل خلا میں بھیجا گیا۔ پاکستان میں پہلا مارشل لا نافذ ہوا۔ اسی مہینے میں محمود غزنوی، اکبرِ اعظم، سرسید احمد خان، بہادر شاہ ظفر اور لیاقت علی خاں پیدا ہوئے۔

اسی مہینے میں اکبرِ اعظم، جہانگیر اور ایڈیسن نے وفات پائی۔ لیاقت علی خان اور انور سادات کے قتل کے واقعات اکتوبر میں ہی پیش آئے۔

سانپ کے سانپ

نیاز احمد مدنی

ساتھیو آپ نے یقیناً چڑیا گھر کی تو ضرور سیر کی ہو گی۔ وہاں آپ نے سانپ گھر بھی دیکھے ہوں گے جہاں قسم قسم کے سانپ گیلی زمین یا شیشوں کے جار میں رینگتے دیکھ کر آپ نے ڈر محسوس کیا ہو گا۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ چڑیا گھر کے اس سانپ گھر میں سانپوں کو قدرتی ماحول فراہم کرنے کے لئے مصنوعی بل، جھاڑ جھنکار اور ٹیلے تیار کئے گئے ہیں جن میں چھپ کر رینگتے ہوئے وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے ان رکھوالوں سے قدرے مانوس ہوتے ہیں جو ان کا پیٹ بھرنے کے لئے کیڑے مکوڑے چھپکلیاں اور چھوٹے موٹے پرندے مار کر ان کے آس پاس ڈالتے رہتے ہیں۔

آیئے آج ہم آپ کو کچھ سانپوں کے بارے میں بتائیں۔ تحقیق کی روشنی میں سانپ، چھپکلی اور مگرمچھ کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کا سلسلہ بالآخر "ڈینو سار" سے جا ملتا ہے یوں تو دنیا میں ان کی تین ہزار سے زیادہ اقسام ہیں تاہم ماہرِ حیوانیات نے جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے ان کو گیارہ خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں عام سانپوں کے علاوہ خطرناک اور انتہائی خطرناک سب ہی قسم کے سانپ شامل ہیں۔ ان کے جسم کی بناوٹ ایک لجلجی موٹی رسی جیسی ہوتی ہے جس میں ہڈیاں تو نہیں البتہ باریک باریک سی گرّیاں ضرور ہوتی ہیں جسے ریڑھ کی ہڈی اور اس کے جوڑوں سے مشابہت دی جا سکتی ہے یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی ریڑھ کی ہڈی میں بارہ جوڑ ہوتے ہیں جبکہ سانپ کی ریڑھ کی ہڈی میں درجنوں باریک جوڑ ہوتے ہیں انہیں جوڑوں کو گرّیاں کہا جاتا ہے۔

خشکی ہو یا تری سانپ ہمیشہ S کی شکل میں حرکت کرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ وقت پڑنے پر تیزی سے دوڑ بھی سکتا ہے لیکن بہت زیادہ اپنے جسم کو موڑ نہیں سکتا۔ سانپ کسی خطرہ کی بو سونگھ کر یا پھر خوراک کی تلاش میں حرکت کرتا ہے ورنہ عموماً خاموش پڑا آرام کرتا رہتا ہے۔ ایک بے حس و حرکت پڑے سانپ کو شناخت کرنا عام طور پر مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ قدرت نے اسے اس کے دشمنوں مثلاً باز اور چیلوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرتی ماحول جیسی رنگت عطا کی

ہے۔ سیاہ اور سفید دھاریوں والے سانپ جنگلی زمین ہی کا ایک حصہ نظر آئیں گے۔ اسی طرح صحرائی اور پہاڑی علاقوں نیز درختوں پر رہنے والے سانپوں کا جسم اپنے گردوپیش کے رنگ میں رنگا ہوا ہو گا۔یہی وجہ ہے کہ سانپ کالے کوڑیالے، بھورے، چتکبرے، ہرے اور مٹیالے غرض ہر رنگ کے ہوتے ہیں۔بعض سانپ تو دیکھنے میں بڑے خوبصورت نظر آتے ہیں لیکن خبردار انہیں کبھی چھونے کی کوشش نہ کیجئے گا اور نہ ان کے قریب جانے کی، اس لئے کہ یہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔

دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جانے والے سانپوں میں کوبرا (ناگ) افعی اور اژدھے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ سیاہ پھن والے ناگ کوبرا کہلاتے ہیں۔ان میں سے بعض تو اس قدر زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کی پھنکار سے خشک گھاس میں آگ لگ جاتی ہے۔ افعی ان سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔اس کا ڈسا ہوا تو پانی بھی نہیں مانگ پاتا جبکہ اژدھے اپنے شکار کے گرد بل ڈال کر اسے اس طرح کس لیتے ہیں کہ ہڈی سرمہ بن جاتی ہے۔ اژدھا بھوک کی حالت میں اپنے شکار کو نگل بھی لیتا ہے۔ عام سانپ، کوبرے اور افعی زیادہ وزنی نہیں ہوتے جبکہ اژدھا کافی لمبا اور اس کا جسم بہت وزنی ہوتا ہے۔ جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں پر تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ سب سے چھوٹا سانپ دو انچ اور سب سے بڑا سانپ ۳۷، ۳۸ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں پائے جانے والے مچھلی جیسے چمکدار چھلکوں والے لجلجے جسم کے سانپ کی لمبائی کم ہوتی ہے جبکہ اسی علاقے میں پایا جانے والا ایک اور سانپ ۱۸ فٹ لمبا ہوتا ہے اور دنیا کے بڑے سانپوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سانپوں کی جسمانی بناوٹ اور ان کے رہن سہن پر ان کے اپنے ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے مثلاً درختوں کی بلند و بالا شاخوں سے جھولنے والے سانپ شاخوں کے گرد اپنے جسم کو بل دینے اور اپنے قریب بیٹھے والے پرندوں کا شکار کرنے میں ہی زندگی کا حقیقی لطف محسوس کرتے ہیں۔اس کے برعکس ۳۷، ۳۸ فٹ طویل (ANACONDA)نامی سانپ گھنے جنگلوں میں آہستہ آہستہ رینگتا ملے گا۔ اس کو پانی میں رہنے کا بڑا شوق ہے۔اچھا تیراک بھی ہے اور چونکہ آنکھیں سر کے بالکل اوپر ہوتی ہیں اس لئے تیرتے ہوئے اپنی کھلی آنکھوں سے گردوپیش کا جائزہ بھی لیتا رہتا ہے۔

سانپ بھی ہماری طرح ایک خاص درجہ حرارت کے عادی ہوتے ہیں اور ماحول کی گرمی یا سردی سے وہ اپنے جسم کے درجہ حرارت میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔عام طور پر سانپ کا جسم خشک مگر ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دنیا کے گرم ترین علاقوں میں ان کی نایاب قسمیں پائی جاتی ہیں۔ سانپ کی مادہ انڈے دیتی ہے اور پھر ان کو سے کر بچے نکالتی ہے

جنہیں ہم سنپولئے کہتے ہیں۔ یہاں پہ ایک دلچسپ بات یہ بتاتے چلیں کہ سانپ کی مادہ انڈوں سے نکلنے والے اکثر سنپولوں کو خود چٹ کر جاتی ہے سانپ، کیڑے مکوڑوں چھپکلیوں، مینڈکوں، چوہوں اور چڑیوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ وہ اپنے شکار کو جبڑوں کے بیچ دبائے رکھتے ہیں اور پھر جب وہ مر جاتا ہے تو اسے نگل جاتے ہیں۔ سانپ کو اپنا شکار ہضم کرنے میں کافی دن لگ جاتے ہیں۔ عموماً ایک بار پیٹ بھر لینے کے بعد انہیں کئی کئی ہفتے بھوک نہیں لگتی اور وہ اپنے بِلوں اور غاروں میں پڑے آرام کرتے رہتے ہیں۔

اور ہاں ایک اور دلچسپ بات تو بتانا ہم بھول ہی گئے، سانپ اپنے جسم کی بیرونی کھال جسے کینچلی کہا جاتا ہے سال بہ سال بدلتے رہتے ہیں۔ کینچلی بدلنے کا عمل کئی کئی گھنٹے جاری رہتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے علاقہ سے گزریں جہاں سانپوں کے بل ہوں تو آپ کو ان کی پرانی کینچلی سُکڑی سمٹی پڑی نظر آئے گی اِسے دیکھ کر آپ کو یوں محسوس ہو گا جیسے سانپ ابھی اپنی کھال اتار کر کسی قریبی بل میں گھس گیا ہے۔

زہریلے سانپوں کے منہ میں قدرت نے دانتوں کے بیچ ایک تھیلی سی بنا رکھی ہے سانپ جب کسی جاندار پر منہ مارتا ہے تو تھیلی میں بھرا زہر دانتوں کے راستے اس کے جسم میں اتر جاتا ہے۔ یہ زہر خون کی شریانوں میں گھل کر جاندار کے حواس معطل کر دیتا ہے اور اگر بروقت علاج نہ ہو تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایسے زہریلے سانپوں سے بچنے کی ضرورت ہے اور ایسی جگھوں پر جانے سے گریز کرنا چاہئے جہاں اس قسم کے زہریلے سانپوں کی موجودگی کا اندیشہ ہو۔

جس طرح انسان کا دشمن سانپ ہے اسی طرح اس کے بھی کئی دشمن ہیں۔ باز اور چیلوں کا ذکر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اِس کا ایک اور دشمن نیولا بھی ہے۔ آپ نے بھی یقیناً سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ یہ لڑائی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ نیولا سانپ کو اپنے تیز اور نوکیلے دانتوں سے کتر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ سانپ اس کے گرد بل ڈال کر اسے اپنے شکنجہ میں جکڑ لینے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اس لڑائی میں دونوں مسلسل قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں لڑائی کا نتیجہ اکثر نیولا کے حق میں ہی نکلتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح سانپ کی پھن کتر ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اور ہاں ایک مزیدار بات چپکے سے کان میں سن لیجئے۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ کہا جاتا ہے کہ سانپ کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں اکثر سانپ کئی کئی سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر کوئی سانپ ایک ہزار سال تک زندہ رہ جائے تو اسے قدرت اپنی "جون" بدلنے کی صلاحیت عطا کر دیتی ہے اور ایسا سانپ خود کو جس روپ اور شکل میں لانا چاہے، لا سکتا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس بات میں کتنا سچ ہے اور کتنا گپ۔

سس...سا...سانپ

ہرے پتے ہرا سانپ

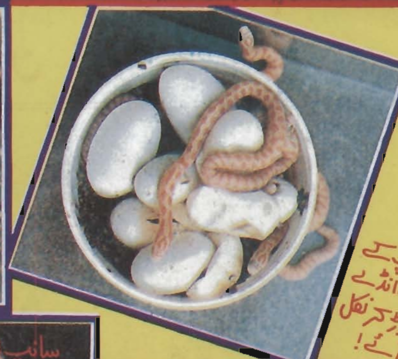

سانپ کے بچے انڈے توڑ کر نکل آئے!

سانپ اپنی کینچلی چھوڑ گیا

کوبرا.....سانپوں کا بادشاہ

سانپ کا زہر نکالنے کے بعد!

سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر!

سومنات کی دہلیز پر

عبدالستار خان

سلطان محمود غزنوی کا نام ہر کسی نے سن رکھا ہے۔ اس نے برصغیر پاک و ہند کے بت کدوں میں اسلام کی ترویج کے لئے سترہ حملے کئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی بے شمار چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہندوؤں کے ساتھ ہوئی تھیں لیکن ان حملوں میں سب سے مشہور، فیصلہ کن اور آخری حملہ سومنات کے مندر پر تھا۔ ذیل میں اسی حملے کو مؤرخوں کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر صوبہ گجرات واقع ہے۔ اس کا ایک مشہور شہر کاٹھیاواڑ بالکل ساحل پر ہے (یہ وہی شہر ہے جہاں قائداعظم کے آباؤ و اجداد رہتے تھے) اس کے سترّ میل جنوب میں سومنات کا مندر تھا۔ یہ شہر جہاں سومنات کا مندر تھا ایک مشہور بندر گاہ تھی۔ وہاں عرب تاجر تجارت کے لئے آتے تھے۔ سومنات بہت بڑا مندر تھا۔ تمام ہندوستان سے ہندو یہاں پر پرارتھنا کے لئے آتے تھے۔ یہاں کا مہاراجہ کنور رائے تھا۔ یہ راجہ مسلمانوں پر بہت

تر طالب علم انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی بچہ انھیں شرارت کرتا ہوا نظر آجائے تو ان کی ہائی ہیل کی سینڈل ہوتی تھی اور بچے کی نازک کمر۔ بس کھٹاکھٹ پٹائی شروع۔

اسکول کے دوسرے بچوں کے برعکس میں مس آغا کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بچوں کی تربیت کے لئے سختی بہت ضروری ہے۔ شرارتی قسم کے طالب علموں سے چونکہ خوف بھی بہت آتا تھا اس لئے فطری طور پر ان سے اُنسیت سی تھی۔ مگر پھر ایک دن اسکول میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے میرے دل سے مس آغا کی قدر کم ہو گئی۔

وہ سخت گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ہم سب بچے بریک ٹائم میں اپنے اسکول کے چھوٹے سے میدان میں کھیل رہے تھے۔ اس میدان میں گیٹ کو چھوڑ کر داہنے طرف لیموں کے دو تین درخت قطار میں لگے ہوئے تھے۔ جن کے سائے نے اچھی خاصی جگہ کو گھیرا ہوا تھا۔ اتنی سخت گرمی میں کھیلنے کے لئے وہ بہترین جگہ تھی۔ تینوں درخت سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کی مہک آس پاس کی فضا کو معطر کر رہی تھی۔

کھیلتے کھیلتے اچانک ہم لوگوں کی نظر تتلی کے ایک جوڑے پر پڑی جو ان درختوں کے درمیان ایک پھول سے دوسرے پھول پر اڑ رہا تھا۔ دونوں تتلیاں اتنی خوبصورت اور بڑی تھیں کہ تھوڑی دیر تک ہم سب حیرت سے دیکھتے رہے۔ ان کے پروں پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے جن میں پیلا اور جامنی رنگ نمایاں تھا۔ ان میں ایک تتلی کا سائز کسی مالٹے سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ ہم میں سے کچھ بچوں کا خیال تھا کہ انھیں پکڑا جائے جبکہ کچھ کا خیال تھا کہ انھیں چھوڑ دینا چاہئے۔ دونوں تتلیاں اب ہماری چہ میگوئیوں سے بے خبر ایک نیچی سی شاخ پر بیٹھ چکی تھیں اور اپنے پروں کو اس طرح کھول بند کر رہی تھیں جیسے تالیاں بجا رہی ہوں۔ ابھی ہم کسی نتیجے پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ جاوید جو ہماری کلاس کا سب سے شریر بچہ تھا اس نے ایک جھپٹا مارا اور بڑی والی تتلی کو پکڑ لیا۔ ادھر اس نے تتلی پکڑی ادھر بریک ٹائم ختم ہونے کی بیل بجی اور ہم سب کلاس کی طرف دوڑ پڑے۔

بریک ٹائم کے بعد ہمارا انگریزی کا پیریڈ ہوتا تھا۔ کچھ مس آغا کا خوف اور کچھ کھیل کی تھکن، ہم سب تتلی کو بھول بھال کر پڑھائی میں مگن ہو گئے۔ ابھی پڑھائی شروع ہونے میں چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ مس آغا کی تیز نظروں نے جاوید کی بے چینی کو بھانپ لیا جو تتلی کو چھپانے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔

”کیا بات ہے جاوید، تمہارا دھیان پڑھائی میں کیوں نہیں ہے“؟ مس آغا نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

جاوید کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ہم لوگ جلدی

کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ۷ جنوری ۱۰۲۶ء کی درمیانی رات تھی۔ سلطان محمود نے چند لمحے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ اس کی تیار کی ہوئی اسکیم کے مطابق فوجوں کی جو تقسیم ہوئی تھی اس پر عمل ہو رہا تھا۔ دستے نقل و حرکت کر رہے تھے، انہیں احکام کے مطابق صبح کی روشنی سے پہلے اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچنا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل کام ان دستوں کا تھا جنہیں شہر کی دیواروں اور دروازوں پر یلغار کرنی تھی۔ جس وقت سلطان محمود اپنے سالاروں کے خون کو گرما رہا تھا۔ سومنات کے مندر کے اندر جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ دس ہزار پنڈت شو دیو کے بت کے آگے اس انداز میں عبادت کر رہے تھے جیسے ماتم ہو رہا ہو، وہ رو رو کر بھجن گا رہے تھے مورخ لکھتے ہیں کہ ہندو قہر اور غضب سے جلدی انھیں بریک ٹائم میں ہونے والے واقعے کے متعلق بتانے لگے۔

"مس جاوید نے بہت خراب حرکت کی ہے۔ اس نے ایک بڑی سی تتلی پکڑ لی ہے" ہمارا خیال تھا کہ مس آغا جاوید کی اس حرکت کو سخت ناپسند کریں گی۔ ان کے بلانے پر جاوید نے خاموشی سے تتلی ان کے حوالے کر دی۔ تتلی ابھی تک زندہ تھی اور مس آغا کی انگلیوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

"یہ تو بہت خوبصورت ہے آپ لوگوں کو کہاں سے ملی"؟

"مس لیموں کے درخت سے، وہاں پر ایک اور تتلی بھی تھی۔" میں نے کہا۔ "ارے تو آپ لوگوں نے وہ کیوں نہیں پکڑی۔ مجھے بتاتے تو میں آپ لوگوں کو تتلی پکڑنے والی جالی منگوا دیتی۔ خیر ایک ہی کافی ہے چلو صائمہ جلدی سے آفس سے پن لے آؤ" انھوں نے کلاس کی ایک اور لڑکی کو پکارا۔ صائمہ فوراً پن لینے بھاگی۔

ہم سب حیرت سے مس آغا کو دیکھ رہے تھے۔ اتنا میٹھا اور نرم لہجہ ان کے منہ سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"آپ سب کو معلوم ہے کہ یہ کتنی نایاب تتلی ہے۔ ایسی تتلیاں بہت کم علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہم اسے فریم کروا کر اس سال اسکول میں ہونے والی نمائش میں رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے اتنی نایاب تتلی پیش کرنے پر آپ کی کلاس کو انعام ملے"۔ انھوں نے صائمہ کے ہاتھ سے پنوں کا ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

پھر مس آغا نے تتلی کے پروں کو اور زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پنوں کے ذریعے دیوار سے لگے ہوئے کیلنڈر میں اگا دیا۔ اس لمحے تتلی کو ہونے والی تکلیف کے احساس سے میرا دل بھر آیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو مجھے کسی بچے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ شاید بچے بڑوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔

ہم جب کلاس میں پہنچے تو دیکھا کہ سارے بچے اس دیوار کے پاس کھڑے تھے جس پر مس

آغا نے تتلی کو لٹکا یا تھا۔ تتلی مر چکی تھی اور اس کے پر زور سے کھینچ کر لگانے کی وجہ سے جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر جو بات بچوں کے لئے حیرت کا باعث تھی وہ لاتعداد براؤن رنگ کے چھوٹے چھوٹے دانے تھے جو تتلی کے ساتھ ہی کلینڈر کی سطح سے چپکے ہوئے تھے۔

"یہ کیا چیز ہے۔ پہلے تو نہیں تھی!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تتلی کے انڈے ہیں۔" ہمارے چوکیدار بابا نے بتایا جو نہ جانے کب وہاں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"بچو! تم نے بڑا ظلم کیا۔ یہ مادہ تتلی تھی جو انڈے دینے کے لئے درخت پر آئی تھی اور تم لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔" چوکیدار بابا نے تاسف سے کہا۔

ہم سب خاموشی سے سر جھکائے ان کی بات سنتے رہے۔

"جاوید کے بچے جی چاہتا ہے تمہیں کچا چبا جاؤں۔" صائمہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے جاوید پر ہی غصہ اتارا۔

دوپہر کو جب مس آغا کلاس لینے آئیں تو انھیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ تتلی کی وجہ سے اتنا اچھا کلینڈر خراب ہو گیا۔ انھوں نے تتلی کو کلینڈر سمیت کوڑے میں پھنکوا دیا کیونکہ اب وہ نمائش میں رکھنے کے قابل نہیں تھی۔ اس چھوٹے سے واقعے کو کچھ دن بعد سب بھول گئے۔

میرے ذہن میں کبھی کبھار ایک منظر گھوم جاتا ہے۔ وہ ایک لیموں کے درخت کا منظر ہے جس پر تتلی کا ایک جوڑا سفید سفید پھولوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان کے ارد گرد بہت ساری پیلے اور جامنی پروں والی ننھی ننھی تتلیاں اڑ رہی ہیں۔

کام کرو ۔ کاہل نہ بنو

ننّھے گڈّو کی دلچسپ، رنگین باتصویر کہانی

ہاں تو اچھے بچو! تم نے دیکھ لیا نا کہ جب گڈو نکما اور کاہل تھا، اس کی آپی ڈانٹتی ڈپٹتی تھیں لیکن جب گڈو کام کاج کرنے لگا تو سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ اچھے اور محنتی بچے اپنا کام خود کیا کرتے ہیں۔ وہ خود کو صاف ستھرا رکھتے ہیں، خود نہاتے ہیں، اپنے بالوں میں خود کنگھا کرتے ہیں، اپنے دانت خود صاف کرتے ہیں، اپنے کپڑے خود پہنتے ہیں، اور کون سے کپڑے پہنتے ہیں، یہ فیصلہ بھی خود ہی کرتے ہیں۔ اور ہاں وہ گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہم سب کو کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ کیونکہ دنیا میں وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جو محنت کے عادی ہوتے ہیں۔

تو پھر بچو! وعدہ کرو کہ تم بھی گڈو کی طرح اچھے بنو گے! ..... بنو گے نا؟ - شاباش

سرکہ اور سلاد
تن دُرست۔ دل شاد

خالِص سرکہ کا استعمال ماہرینِ طب کے مُطابق بہت سے امراض کا علاج بھی ہے اور ان سے بچاؤ کی تدبیر بھی۔ خاص طور پر گرمی اور برسات کے موسم میں خالِص سرکہ کا استعمال نہایت ضروری ہے۔

احمد فروٹ وِنیگر خالِص سرکہ ہے جو پھلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور عام بازاری سرکہ کے مقابلے میں صحت کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔

MASS

نوری کی

شبیر بیگ ناز

میں نازک سی تتلی ہوں
گلشن گلشن اڑتی ہوں
رنگوں کی شہزادی ہوں
سب کو اچھی لگتی ہوں
جو بھی مجھ کو پکڑے گا
میرے پیچھے بھاگے گا
بھاگ بھاگ تھک جائے گا
اپنی جان کھپائے گا
اس کے ہاتھ نہ آؤں گی
میں اونچا اُڑ جاؤں گی

نوری کی بلی
نام اس کا للی
بھوری نہ کالی
سبز آنکھوں والی
کھاتی ہے رغبت
پیتی ہے دودھ
اس کو نہ چھیڑو
اس کو نہ گھیرو
غصہ کرے گی
اور کاٹ لے گی

تتلی

شبیر بیگ ناز

ہم سب نافرمان ہیں

امتیاز جلیل

عقیل صاحب ایک سرکاری محکمے میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام وسیم تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عقیل صاحب اور ان کا بیٹا اکیلے رہا کرتے تھے کیونکہ عقیل صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور انہوں نے پھر دوسری شادی نہیں کی تھی۔

عقیل صاحب کے کاندھوں پر دوہری ذمہ داری تھی۔ وسیم کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی ۸ سال ہوگی لہٰذا اس کا ہر قسم کا خیال رکھنا دفتر کے کاموں کے علاوہ بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ عقیل صاحب بڑے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ انہیں پورا پورا احساس تھا کہ باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ اب تک اس ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے آئے تھے۔

وسیم ویسے تو بہت اچھا بچہ تھا اور عموماً عقیل صاحب کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی وسیم ان کی نافرمانی بھی کر دیتا تھا۔

عقیل صاحب نے اپنی طرف سے چونکہ وسیم کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس لئے وہ وسیم سے ہمیشہ فرمانبرداری کی توقع کرتے تھے۔

آج خلافِ معمول وسیم کی حرکات کچھ عجیب سی تھیں۔ صبح جب وہ سو کر اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر اپنے ابو کے پاس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا۔ "وسیم بیٹے...... دانت صاف کئے ہیں؟" "نہیں ابو!" وسیم نے انکار میں سر ہلایا۔

"میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ صبح دانت ضرور صاف کیا کرو۔ جاؤ جا کر دانت صاف کرو جب تک میں ناشتہ تیار کرتا ہوں۔"

وسیم دانت صاف کرنے جانے کے لئے گیلری میں سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ باہر موسم بڑا سہانا ہے اور ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ وہ بارش دیکھنے میں ایسا مگن ہوا کہ اسے دانت صاف کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اسے تو تب ہوش آیا جب عقیل صاحب اسے ناشتے کے لئے آوازیں دے رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر اس کا پسندیدہ ناشتہ موجود تھا اور اس کے ابو بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"دانت صاف کر لئے بیٹے؟" انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"وہ...... باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں یہ منظر دیکھنے میں ایسا گم ہوا کہ مجھے دانت صاف کرنا یاد ہی نہیں رہا۔" وسیم نے بسورتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھو دانت صاف کرنا بہت ضروری ہے۔ اب جلدی جلدی ناشتہ کر لو اور پھر اسکول جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

عقیل صاحب دفتر جاتے ہوئے وسیم کو اس کے اسکول چھوڑ دیا کرتے تھے۔ چھٹی میں اسکول بس وسیم کو ان کے پڑوس میں چھوڑ جاتی تھی جہاں وہ شام تک اپنے دوست کمال کے ساتھ رہتا۔ دونوں ایک اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔

عقیل صاحب تیار ہوئے تو دیکھا وسیم اپنے جوتے پالش کر رہا تھا۔

"وسیم! میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جوتے سونے سے قبل پالش کر لیا کرو۔"

"ابو! وہ دراصل رات کو ٹی وی پر فلم دیکھتے دیکھتے نیند آنے لگی اور میں آکر سو گیا۔ مجھے جوتے پالش کرنے کا خیال آیا تو تھا مگر اس وقت اس قدر نیند آرہی تھی کہ میں نے سوچا کہ اب صبح ہی پالش کر لوں گا۔"

"اور یہ تم نے اپنی قمیص بھی استری نہیں کی ہے۔ رات کو جب میں اپنے کپڑے استری کر رہا تھا تو میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنے کپڑے بھی مجھے دے دو تاکہ میں استری کر دوں مگر تم نے کہا کہ تم خود تھوڑی دیر بعد کر لو گے۔ بیٹے! اسکول کے استاد اور خود تمہارے دوست کیا سوچیں گے کہ یہ کتنا گندہ لڑکا ہے جو اپنے کپڑے بغیر استری کے ہی پہن کر آ گیا ہے۔ آئندہ تم ضرور

رات کو ہی اپنے کپڑے استری کر لو گے ورنہ مجھے دینا تاکہ میں استری کر دوں۔ ٹھیک ہے؟" عقیل صاحب نے جواب طلب نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ابو!" وسیم نے جواباً کہا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا لگ رہا تھا۔

عقیل صاحب اسے گاڑی میں بٹھا کر اسکول لے گئے۔

شام کو جب عقیل صاحب دفتر سے گھر واپس آئے تو وسیم اسکول یونیفارم پہنے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

عقیل صاحب ہمیشہ اسے تاکید کرتے تھے کہ وہ اسکول سے آکر فوراً یونیفارم تبدیل کر لیا کرے لہٰذا جب انھوں نے اسے اسکول کے کپڑوں میں ملبوس دیکھا تو پہلے پہل تو وہ ذرا خفا ہوئے لیکن پھر انھوں نے بڑے پیار سے اسے ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ اسکول کے کپڑے جلدی تبدیل کر لینے چاہئیں تاکہ وہ گندے ہونے سے بچ سکیں...... اور وسیم ان کی باتوں کو غور سے سنتا رہا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب عقیل صاحب ٹی وی لاؤنج پہنچے تو وہاں وسیم پہلے سے موجود تھا۔

"بیٹا! وہ آج کا ہوم ورک کر لیا؟"

"اوہ!" وسیم میاں ایک دم چونک گئے۔ "میں اور کمال آج دوپہر کو کیرم کھیلتے رہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شام کو ہوم ورک کر لوں گا مگر مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ خیر کوئی بات نہیں کھانا کھا کر کر لوں گا۔"

"نہیں وسیم! ٹی وی دیکھنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ پہلے تم اپنا کام مکمل کرو۔ اسکول کا کام وقت پر مکمل کرنا بہت ضروری ہے۔" عقیل صاحب نے اسے سمجھایا۔

"لیکن ابو! دیکھیں ناں کتنا اچھا پروگرام آرہا ہے اور پھر اب کھانے کا وقت بھی تو ہونے ہی والا ہے۔ میں کھانا کھا کر ضرور اپنا کام کر لوں گا۔" وسیم نے ٹی وی پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا اور عقیل صاحب مزید اسے کچھ نہ کہہ سکے۔

عقیل صاحب کا خانساماں چونکہ آج چھٹی پر تھا اس لئے نو بجے عقیل صاحب بازار سے کھانا لینے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد عقیل صاحب نے وسیم سے کہا۔

"وسیم! وہ جمال صاحب شام کو اخبار لے گئے تھے۔ ان سے جا کر لے آؤ۔ اور ہاں ذرا جلدی آنا۔"

"جی اچھا!" وسیم یہ کہہ کر باہر نکلا تو اسے سامنے سے عظیم آتا دکھائی دیا۔ دونوں دوست دس منٹ تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ آخر عقیل صاحب خود باہر نکلے کہ دیکھیں وسیم ابھی تک اخبار لے کر کیوں نہیں آیا؟

باہر نکلتے ہی ساری صورتحال ان پر واضح ہو گئی۔
ان کو ایک دم وسیم پر غصہ آگیا۔ وہ فوراً اس کی طرف لپکے اور دو زور دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیئے۔ عقیل صاحب آخر صبح سے ضبط کر رہے تھے۔ وسیم نے آج نافرمانی کی انتہا کر دی تھی۔

گھر آنے کے بعد عقیل صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وسیم بھی آنکھوں میں آنسو لئے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

ابھی عقیل صاحب کو بستر پر لیٹے ذرا ہی دیر ہوئی تھی مگر ان کو رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ مجھے برداشت سے کام لینا چاہئے تھا۔ آخر وسیم بچہ ہی تو ہے۔ اگر اس نے میرا کہنا نہیں مانا تو یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ ابھی تو اس کی کھیلنے کودنے کی عمر ہے۔ بچے تو ایسا ہی کرتے ہیں۔

عقیل صاحب کو بڑا افسوس ہوا کہ انہوں نے غصے میں آکر اپنے بیٹے کو مارا۔ آخر وہ اٹھے اور وسیم کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ وسیم اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہو گا اور ابھی تک رو رہا ہو گا۔ مجھے جا کر اسے تسلی دینی چاہئے۔

مگر ان کا یہ خیال غلط نکلا۔ جب وہ وسیم کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا وسیم گہری نیند سویا ہوا تھا۔ البتہ دیر تک رونے کے باعث اس کی پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وسیم کے کھلونے اس کے پلنگ کے پاس پڑے تھے جن سے وہ اپنے افسردہ دل کو بہلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر عقیل صاحب کا دل بھر آیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا اور سوتے میں اس کو پیار کیا۔ لیکن اس واقعہ نے ان کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا۔ وہ وسیم کے کمرے سے نکل آئے۔ وضو کیا اور عشاء کی نماز ادا کی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ سوچنے لگے کہ جو کچھ آج میرے اور میرے بیٹے کے درمیان ہوا ہے ویسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا خالق و مالک ہے۔ اس دنیا میں بھیجے جانے کے کچھ مقاصد ہیں جنہیں ہم بھول چکے ہیں۔ میرے بیٹے نے دن میں چند بار میری نافرمانی کی تو میں نے اسے سزا دے ڈالی جبکہ میری کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اپنے مالک کی تو میں خود نہ جانے دن بھر میں کتنی نافرمانیاں کرتا ہوں۔ میرا مالک تو مجھے ان نافرمانیوں کی بہت بڑی سزا دے گا۔ مجھے اپنی نافرمانیوں کا تو کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ اللہ کی سزا تو یقیناً بہت سخت ہے۔ ....

لیکن نہیں! میں نے بھی تو آخر اپنے بیٹے کو معاف کر دیا ہے۔ مجھے اپنے بیٹے سے اتنی محبت ہے کہ میں نے اس اس کی نافرمانیوں کے باوجود معاف کر دیا ہے تو اللہ تو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ تو رحیم و کریم

ہے۔ وہ مجھے اور دیگر نافرمانوں کو کیونکر معاف نہیں کرے گا۔ بس صرف ضرورت اس سے معافی طلب کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کی ہے۔

اور پھر ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔
(مرکزی خیال ایک انگریزی نظم سے ماخوذ)

معذرت

آنکھ مچولی کا مستقل سلسلہ "چیزوں کی کہانی" جناب آصف فرخی صاحب تحریر کرتے ہیں۔ ماہِ ستمبر کے شمارے میں اس سلسلے کے ساتھ ان کا نام شائع ہونے سے رہ گیا۔ اسی شمارے میں نظم "چوک کی بتیاں" پر شاعر جناب پروفیسر عنایت علی خان صاحب کا نام بھی شائع نہ ہوسکا۔ ادارہ اس سہو پر اپنے محترم مصنفین سے معذرت خواہ ہے۔

اعلان

ہمارے بار بار کے اعلان کرنے کے باوجود کچھ حضرات اپنی نگارشات کے ساتھ اپنا نام اور مکمل پتا تحریر نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریر کے معاوضے کی بروقت ترسیل نہیں ہوپاتی اور مصنف کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ اس لئے معزز قارئین و مصنفین براہِ کرم اپنی ہر تحریر کے ساتھ الگ سے اپنا نام اور مکمل پتا لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ مندرجہ ذیل رائٹرز سے گزارش ہے کہ جلدازجلد اپنے پتے ادارے کو بھیجیں تاکہ ان کو ان کی نگارشات کا اعزازیہ روانہ کیا جاسکے۔

(۱) جناب علی جبران صاحب، راولپنڈی۔ (۲) جناب علی گوہر چوہان صاحب، کہروڑ پکا۔ (۳) جناب سرمد ایوب صاحب۔ (۴) جناب اکبر علی خان عرشی زادہ صاحب۔ (۵) جناب عاطف اقبال صاحب، لاہور۔ (۶) جناب مجاہد حسین باسط صاحب (۷) محترمہ ماریہ فرخ سید صاحبہ۔ (۸) محترمہ لالہ رخ شوکت صاحبہ۔

پاکستان کوئز — مزید انعامات

اگست کے شمارے میں پاکستان کوئز کے سوالات شائع کئے گئے تھے اور جوابات وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۲ ستمبر مقرر کی گئی تھی لیکن غلطی سے نتائج کا اعلان ستمبر کے شمارے میں کر دیا گیا...... ساتھیوں نے اس پر حیرت اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ چونکہ شکایت بجا تھی اس لئے بعد میں آنے والے جوابات کو بھی مقابلے میں شامل کر لیا گیا ہے اور ان کے لئے علیحدہ سے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ مقابلے میں صرف ان ساتھیوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے جوابات رسالے کے مارکیٹ میں آنے سے پہلے ہمیں مل گئے تھے۔ اُمید ہے اب ساتھیوں کی شکایت بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

موصول ہونے والے جوابات میں تمام سوالوں کا درست جواب تو کسی نے نہیں دیا ہے۔ تاہم محمد اسلام رضا، لاہور اور عرفان احمد، شیخوپورہ کی ایک ایک غلطی کے باوجود انہیں انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ادارہ ان دونوں ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

دو یا دو سے زیادہ غلط جواب دینے والوں کے نام

امیر عبداللہ، ضلع چکوال۔ عبدالرزاق میاں، جدہ، سعودی عرب۔ وسیم احمد، گلگت۔ سعدیہ مقصود، جہلم شہر۔ جاوید اقبال، جھنگ صدر۔ ثمینہ رانی۔ نثار احمد ہاشمی، یوپی موڑ، نارتھ کراچی۔ محمد اختر سعیدی، ابراہیم خلیل، جدہ، سعودی عرب۔ شہناز پروین، اوتار بجانی، حیدر آباد۔ محمد رئیس انصاری، نواب شاہ۔ محمد افضل مراد، ملتان۔ سائرہ خان، بہاولپور۔ رابعہ طیبہ شجاع، چکوال۔ سمیع اللہ، ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ محمد فاروق بشیر، گجرات۔ شازیہ حسن، پاکپتن۔ محمد وحید، تحصیل جنڈ، ضلع اٹک۔ میاں عبدالسمیع، رحیم یار خان۔ غفرانہ سندس، لاہور۔ فضل نبی، ریاض، سعودی عرب۔ امان اللہ، اوکاڑہ۔ عبدالقدیر، راولپنڈی۔ رضوانہ شاہ، میانوالی۔ قیصر حمید، گولیمار، کراچی۔ عظمیٰ سعید، میرپور خاص۔ محمد اظفر سیف الاسلام، حیدر آباد۔ سہیل احمد، بلال ٹاؤن۔ نارتھ کراچی۔ عظمیٰ گل، نوشہرہ کینٹ۔ قرۃ العین، ڈیرہ غازی خان۔ یاسر قیوم، کوئٹہ کینٹ۔ عامر خان، کوئٹہ کینٹ۔ ہارون سلام، مسلم ٹاؤن، نارتھ کراچی۔ عظمیٰ عزیز، طارق محمود، منگلا کینٹ۔ عطیہ مشتاق، فیصل آباد۔ محمد اسلام رضا، لاہور۔ قیصر بیگ، شاہ پور چاکر، سندھ۔ ارم تنویر، لاہور۔

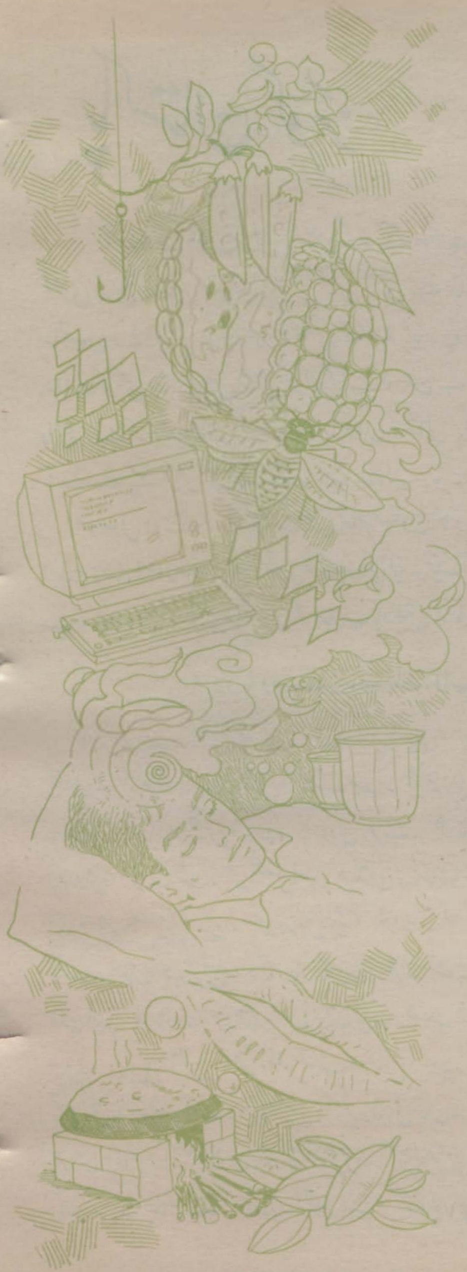

بوجھو تو جانیں

ادارہ

"بوجھو تو جانیں" آنکھ مچولی کا نیا انعامی سلسلہ۔ جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اس کا ثبوت وہ ہزاروں خطوط ہیں جو ہمیں موصول ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس ماہ قرعہ اندازی کے ذریعے تین ساتھیوں کو گھڑیاں انعام کے طور پر دی جا رہی ہیں۔ آئندہ ماہ سے انعامات کی تعداد دو ہوگی۔ اور ایک تحفہ اس ساتھی کے لئے جس کی منتخب پہیلیاں اس شمارے میں شائع ہوں گی۔ اس ماہ کی پہیلیاں ہمیں نائلہ بختیار نے کوہاٹ سے ارسال کی ہیں۔ "بوجھو تو جانیں" کے جوابات وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۰/ اکتوبر ہے۔

(۱) جاگو تو وہ پاس نہ آئے
سو جاؤ تو روپ دکھائے

(۲) جب بھی اس کو غصہ آئے
سب کو چھوڑ کر لکڑی کھائے

(۳) بھورا حلوہ، اندر ہڈی
ہر دم اِک دُوجے سے چپکی

(۴) میں نے ایسی بین بجائی
خود نہ سُنی اوروں کو سنائی

(۵) لگ لگ کہو تو نہ لگیں
مت لگ کہو تو لگ جائیں

(۶) ہاتھ لگے نہ ہاتھ میں آئے
بس کانوں سے پکڑی جائے

(۷) اک چیز ایسی کہلائے
ہر مذہب کا آدمی کھائے

(۸) مٹی کا گھوڑا لوہے کی لگام
اترو بی بی وعلیکم السلام

(۹) کھائے لوہا • اُگلے آگ
گائے ہر دم موت کے راگ

(۱۰) سب بیٹے بچھڑے بچھڑائے
آخر ماں کی گود میں آئے

(۱۱) ایک بلا نے مشکل ڈالی
گھر گھر میں بجتی ہے تالی

(۱۲) دیکھنے میں وہ مکئی کا دانہ
پیٹ میں اس کے جڑا خزانہ

(۱۳) دانہ گھاس نہیں یہ کھاتا
اور دماغی دوڑ لگاتا

(۱۴) ہری ڈبیا سفید دانے
اس میں بیٹھے حبشی دیوانے

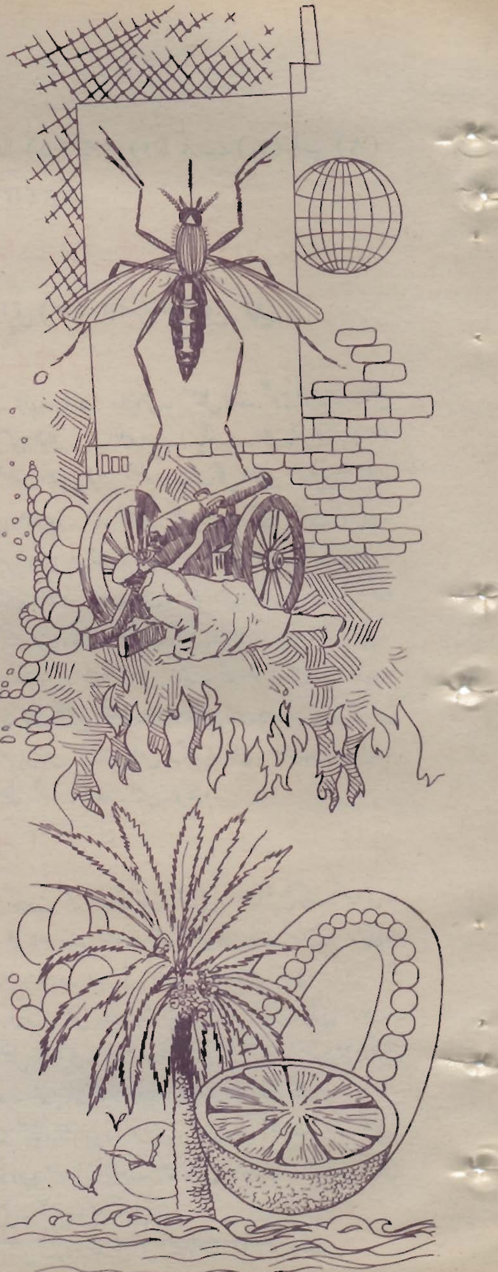

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے درست جوابات :......

(۱) چھینک (۲) سائیکل (۳) روزہ (۴) جاء نماز (۵) چھری (۶) تارے (۷) بلب (۸) روپیہ (۹) گلاب کا پھول (۱۰) انڈا (۱۱) وقت (۱۲) جوتا۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی :......

(۱) شمع قریشی، لاہور (۲) آصف حسین، کراچی (۳) رانا اسرار احمد خان، کمالیہ

بالکل درست جوابات بھیجنے والے ساتھیوں کے نام :......

شاہین قریشی، کراچی۔ عبداللہ خورشید احمد، ہری پور۔ زاہدہ رحمت، ساہیوال۔ سہیل ملک، گوجرانوالہ۔ طارق حسین، نواب شاہ۔ فریحہ ارم، بہاول پور۔ ناجیہ غضنفر حسین شاہ، گوجرانوالہ۔ عبدالحکیم ایوب، سیالکوٹ۔ محمد عامر اصغر، (؟) سائرہ بٹ، لاہور۔ اورنگزیب زید، آزاد کشمیر۔ خاور ندیم، جہلم۔ عمران نواز، جہلم۔ صائمہ گل اعوان، کراچی۔ خالدہ جبیں اعوان، کراچی۔ محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ۔ ارشد علی ارائیں، شکارپور۔ شاہد حسین، سکھر۔ سید مطیع الرحمٰن، کراچی۔ صوفیہ وحید، کراچی۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔ رابعہ ظفر، رحیم یار خان۔ سید منیر آفاق سبزواری، راولپنڈی۔ یوسف حسن شیخ، کراچی۔ سرفراز احمد، ملتان۔ عابد ملک، ملتان۔ فیصل مختار، ملتان۔ اعجاز علی، ملتان۔ محمد علی، ٹنڈو آدم۔ شاہد لودھی، سکھر۔ شہزاد سلیم سومرہ، جیکب آباد۔ فہیم عزیز، مانگی۔ کاشف ریاض، لاہور۔ نعیمہ ناز، کراچی۔ راشد منہاس ثاقب، قصور۔ مونا قادری، کراچی۔ سہیل عباسی، ساہیوال۔ محمد اصغر علی، کمالیہ۔ محمد اکرم سلیم ساقی، کمالیہ۔ تمینہ یاسمین، کمالیہ۔ محمد اشفاق علی، ساہیوال۔ محمد اقبال، کمالیہ۔ جاوید گلشن، قصور۔ ایم اسماعیل شاہ، دھابے جی۔ شاہ رخ حبیب، ٹھٹھہ۔ سائرہ مقصود، لاہور۔ ذیشان اظہر چوہدری، رحیم یار خان۔ عثمان یونس، رحیم یار خان۔ مہتاب حیدر، لیہ۔ شازیہ نورین، اسلام آباد۔ محمد زاہد علی مجاہد، کمالیہ۔ غلام مصطفٰے، قصور۔ سعدیہ امین، اوکاڑہ۔

ایک غلطی کرنے والے چند ساتھیوں کے نام :......

عرفان منیر، لاہور۔ ایم اے حمید، لاہور۔ عثمان احمد، لاہور۔ محمد حبیب خان، کراچی۔ مرزا فرخ بیگ، کراچی۔ حافظ سید یاسر حسین نقوی، کراچی۔ سید احسن علی، کراچی۔ محمد ناصر خالد، لاہور۔ محمد فیصل عزیز خان شیروانی، کراچی۔ عبدالحفیظ شاہد، خانیوال۔ الماس حیدر، کراچی۔ آغا زاہد یار خان، ہزارہ۔ ناصر علی، دادو۔ حافظ غلام حسین، کراچی۔ راؤ محمد شاہد اقبال، نواب شاہ۔ امبر خان، کراچی۔ محمد عامر شہزاد، لاہور۔ لبنیٰ سعدیہ، کراچی۔ آصف جاوید، پنڈی بھٹیاں۔ شاہ رخ ہمایوں، پنڈی بھٹیاں۔ ہما کریم، کراچی۔ منہاج افضل، کراچی۔ عبدالاحد قریشی، آزاد کشمیر۔ سیدہ ثانیہ تابش الوری، بہاولپور۔ محمد فاروق منیر، لاہور۔ صنوبر اسحاق، سکھر۔ محمد شاہد شاکر، حیدر آباد۔ عافیہ طاہر خان، سرگودھا۔ قیصرہ منظور احمد، منڈی بہاء الدین۔ آمنہ رقیب، کراچی۔ آغا وسیم حیدر، کراچی۔ قیصر نوید، گجرات۔ محمد نعمان، کراچی۔ محمد طیب شکور، وہاڑی۔ کامران اعتماد، بتی۔ عروہ وحید سلیمانی، لاہور۔ محمد فیصل، واہ کینٹ۔ افشین قریشی، کراچی۔ رانا عبدالمجید شاہین، خانیوال۔ سہیل احمد خان، کراچی۔ معین ہاشمی، کراچی۔

ہم اپنے ان ہزاروں ساتھیوں سے معذرت خواہ ہیں جن کے نام جگہ کی کمی کے باعث شائع نہ ہو سکے۔

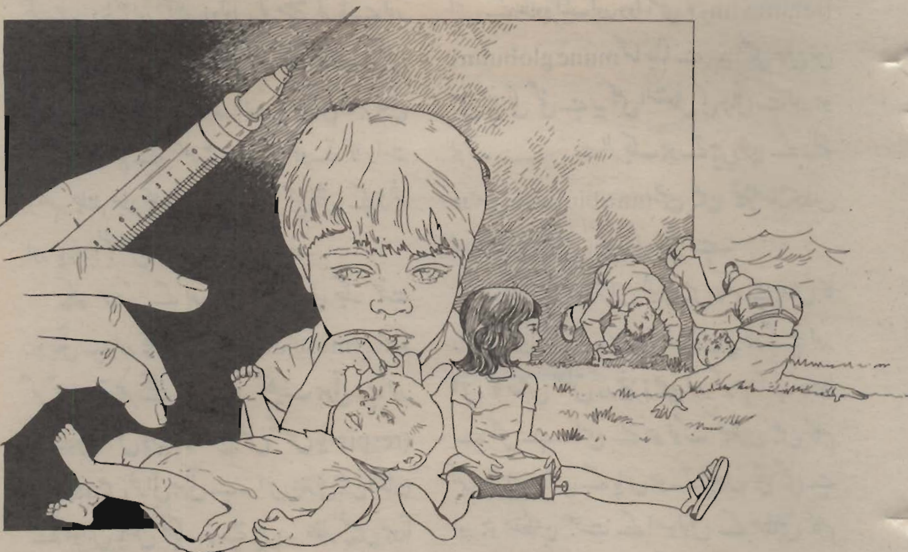

بچو ٹیٹنس سے بچو

طلعت جاوید

روز مرّہ کی زندگی میں اکثر بچوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ کھیلتے ہوئے ان کے پاؤں میں کیل چُبھ جاتی ہے یا پھر کوئی گہرا زخم لگ جاتا ہے۔ بچے اس کو معمولی تکلیف سمجھ کر گھر میں اس کا ذکر نہیں کرتے یا پھر اگر کرتے بھی ہیں تو باپ ماں تعلیم نہ ہونے کے سبب اس کو اہمیت نہیں دیتے ہیں اور ایک مصیبت کھڑی کر لیتے ہیں کیونکہ اس زخم یا کیل کے چبھنے سے تشنج یا ٹیٹنس جیسی بیماری ہو جاتی ہے جس سے اکثر موت واقع ہو جاتی ہے۔

ٹیٹنس ایک ایسے جراثیم کے گروہ سے ہوتا ہے جو کہ بہت زہریلا ہوتا ہے اور زخم کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر زہر پھیلاتا ہے اور مریض کو زیادہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے۔ اس بیماری کے جراثیم کا نام کلوسٹریڈیم ٹیٹنائی (clos-tridium tetani) ہوتا ہے۔ دھوپ کی گرمی ان کے جراثیم کو مارنے میں کامیاب ہوتی ہے ورنہ یہ آسانی سے نہیں مرتے۔

ان جراثیم کا زہریا (toxin) جو ہے وہ انسان کے علاوہ (nervecells) پر حملہ کرتا ہے اور اس

طرح یہ دماغ اور آنکھ دونوں کو متاثر کرتا ہے اور انہیں مفلوج کر دیتا ہے۔ جراثیم کے جسم میں داخل ہونے کے چار دن کے اندر اندر یہ بیماری ظاہر ہوتی ہے۔ جراثیم کے جسم میں داخل ہونے کا راستہ زخم، جلنا، جلد کا زخم، ہڈی ٹوٹنا، آپریشن کے زخم اور یا پھر انجکشن لگانے والی جگہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ان زخموں کی جگہ سخت ہو جاتی ہے اور پھر یہ گلے کے (muscles) پر حملہ کرتا ہے تو پھر نگلنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور موت کی اصل وجہ در اصل عمل تنفس یا (respir-ation) میں خرابی ہوتی ہے۔ اس بیماری میں انسان کے حواس بالکل ٹھیک رہتے ہیں۔ بخار نہیں ہوتا سوائے کچھ خاص صورتوں کے۔

اس بیماری کی علامات میں سب سے پہلے سر میں درد ہوتا ہے اور اداسی پورے وقت طاری رہتی ہے اور اس کے بعد کوئی بھی چیز نگلنے میں یا منہ کھولنے میں تکلیف ہونے لگتی ہے کیونکہ یہ جراثیم زہر خارج کرتے ہیں اور اس کے بعد گردن میں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے اور مریض کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی گردن ہلا سکے اور اپنی تھوڑی کو سینے پر جھکا سکے اور پھر یہ درد بڑھ کر گردن اور پیٹ کے (muscles) میں بھی ہو جاتا ہے اور پھر ضروریات سے فارغ ہونے میں بھی مریض کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔

اس بیماری کے علاج کے لئے (antibiotic) مثلاً پینسلین (pencillin) استعمال کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور دوا جس کو (tetanusim-mune globulin) کہا جاتا ہے، یہ ابھی حال ہی میں تیار کی گئی ہے یہ بھی استعمال کی جاتی ہے اور جو لوگ پنسلین سے الرجک ہوتے ہیں ان کے لئے دوسری (antibiotics) جن میں ٹیٹراسائکلین اور دوسری دوائیں تجویز کی جاتی ہے۔

یہ بیماری زیادہ تر ان ملکوں میں عام ہے جہاں کا رہن سہن ابھی تک پرانے طریقوں پر ہوتا ہے اور اس کا خاص تعلق زرخیز زمین اور گرم آب و ہوا سے بھی ہے۔ اسی لئے جو لوگ کھیتوں میں کام کرتے ہیں، جن کے پاس جوتے چپلوں کی کمی ہے اور جو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق کام نہیں کرتے ہیں اور جنہیں اگر زخم لگ جائے تو اس کی پرواہ نہیں کرتے ہیں، انہیں یہ بیماری ہونے کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

بچاؤ کا طریقہ :

اس بیماری سے بچاؤ کے لئے سب سے پہلے یعنی پیدائش کے فوراً بعد اس کا پہلا ٹیکہ لگواتے ہیں۔ دوسرا ٹیکہ ایک سال کے بعد اور تیسرا ٹیکہ بچے کو اسکول میں داخل کروانے سے پہلے لگایا جاتا ہے۔ اور دس سال کے بعد اس سے بچاؤ کے لئے ٹیکے لگواتے رہنے چاہئے تاکہ اگر کہیں گر جائیں یا کوئی زخم لگ جائے تو زیادہ مسئلہ نہ ہو۔

زخم ہو جانے اور کیل چبھ جانے کی صورت میں فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔

کتّا اور چور

محسن خان

کام کرنے والے :- مالک، مالکن، چنٹو، پنٹو، قاسم صاحب اور چور

رات کا وقت .... سب لوگ سو رہے ہیں، پنٹو جاگ رہا ہے۔ اچانک ایک چور دیوار کے اوپر سے جھانکتا ہے۔ پنٹو زور زور سے چلاتا ہے۔

پنٹو .... کون ہے ....؟ (خاموشی)

" یہ اتنی رات کے وقت دیوار کے اوپر سے کون جھانک رہا ہے؟ (چور خاموشی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)

" میں پوچھتا ہوں تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ اس وقت کہ جب اتنی رات ہو گئی ہے اور ہمارے گھر میں سب لوگ سو رہے ہیں تو تم کیا کرنے آئے ہو؟ دیوار پر چڑھ کر چوروں کی طرح کیوں جھانک رہے ہو؟" (چور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے) "نہیں مانو گے؟ اچھا تو دیکھو میں ابھی مالک کو جگاتا ہوں وہ تمہاری خبر لیں گے۔"

(پنٹو دوڑتا ہوا مالک کے کمرے کے پاس جاتا ہے اور خوب زور زور سے بھونکتا ہے)

" جلدی اٹھئے مالک، جلدی اٹھئے ...... باہر آکر دیکھئے دیوار کے اوپر سے کوئی آدمی جھانک رہا ہے۔ مجھے اس کی نیت صاف نہیں معلوم ہوتی، شاید کوئی چور ہے .... اٹھئے مالک، جلدی اٹھئے۔"

(کمرے سے مالک کی آواز آتی ہے)

مالک .... " نیند حرام کر دی اس کتے کے بچے نے، سارا گھر سر پر اٹھالیا۔"

(مالک باہر آکر لائٹ جلاتا ہے)

پنٹو .... " لائٹ مت جلائیے مالک، لائٹ بجھا دیجئے۔"

مالک .... کیوں چلاتا ہے بے...... ! کیا آج تجھے روٹی نہیں ملی...... ؟

پنٹو .... " یہ بات نہیں مالک .... آپ میرا کہنا مانئے ذرا باہر آکے تو دیکھئے۔"

پنٹو قلانچیں بھرتا ہوا آنگن میں جاتا ہے مالک بھی پنٹو کے پیچھے جاتا ہے

پنٹو .... (دیوار کی طرف دیکھ کر، اپنے آپ سے کہتا ہے) " ارے، وہ تو چلا گیا۔"

مالک .... " کچھ بھی تو نہیں ہے۔ پھر کیوں چلا رہا تھا........... ؟ "

پنٹو .... " ابھی، ذرا دیر پہلے ایک آدمی دیوار کے اوپر سے گھر میں جھانک رہا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے کی کوشش کی مگر وہ مانا ہی نہیں اور زیادہ جھانکنے لگا اور جب میں آپ کو بلانے کے لئے اندر آیا تو وہ بھاگ گیا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چور ہی تھا شاید ابھی باہر کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ دروازہ کھول کر باہر چلئے۔ آیئے، جلدی آیئے۔"

پنٹو ڈیوڑھی میں جاتا ہے۔ مالک بھی جاتا ہے پنٹو دروازے پر پیر رکھ کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کنڈی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مالک ادھر ادھر دیکھتا ہے...........

" اب سوچئے نہیں مالک، جلدی سے دروازہ کھول دیجئے۔"

مالک .... (اپنے آپ سے) " شاید کوئی بلی ہو گی........... ؟ "

پنٹو .... بلی نہیں مالک چور تھا چور .... کیا میں بلی کو نہیں پہچانتا۔ بلی کا منہ بھلا آدمی کے منہ کی طرح ہوتا ہے .... اور پھر بلی ہوتی تو چوروں کی طرح نہ جھانکتی، روزانہ کی طرح دیوار پر چلتی ہوئی چھت پر چلی جاتی۔ "

مالک .... (ڈانٹ کر) " چوپ .... آدھی رات کو اٹھا دیا! اتنی سردی میں ابھی دو چار لاتیں ماروں گا تو ساری چوکڑی بھول جائے گا۔"

پنٹو دم دبا کے اپنے بوریئے کے پاس آتا ہے اور پنجوں پر تھوتھن رکھ کر خاموشی سے بیٹھ جاتا

ہے۔ ذرا دیر کے بعد کمرے سے مالکن نکلتی ہیں۔

مالکن .... (ڈری ڈری آواز میں) "کیا بات ہے .... ؟"

مالک .... "کچھ بھی نہیں، بلاوجہ شور مچا رہا تھا۔ کیا آج اسے روٹی نہیں دی ؟"

مالکن .... "دی کیوں نہیں تھی .... ؟"

پنٹو .... (ڈرتے ڈرتے) اسی کا تو حق ادا کر رہا ہوں مالک .... !

مالک .... (زمین پر پیر پٹخ کر دھمکاتے ہوئے) "نہیں چپ رہے گا۔"

پنٹو دم دبا کر جلدی سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس وقت چنٹو روتا ہوا کمرے سے نکلتا ہے۔

چنٹو .... "ممی ! ڈر لگ رہا ہے۔"

مالکن .... "نہ نہ بیٹے، ڈرتے نہیں۔"

(مالکن چنٹو کو گود میں لے کر کمرے میں چلی جاتی ہے اس کے پیچھے مالک جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔)

دوسرا سین

(صبح کا وقت۔ مالک، مالکن اور چنٹو کرسیوں پر بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں پنٹو زمین پر بیٹھا ہوا ایک ایک کا منہ تاک رہا ہے۔ کبھی کبھار چنٹو ایک آدھ نوالا پنٹو کی طرف اچھال دیتا ہے۔ پنٹو نوالے کو اس طرح منہ میں لے لیتا ہے جیسے کھلاڑی گیند کیچ کرتے ہیں)

چنٹو .... (خوف بھری آواز میں) "پاپا ! رات میں جب پنٹو بھونکتا ہے تو ہمیں ڈر لگتا ہے۔"

مالک .... "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے بیٹے کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

مالکن .... (غصہ کے ساتھ پنٹو کی طرف دیکھتی ہوئی) "اس کی طرح تو کوئی بھی کتا نہ بھونکتا ہو گا اس کی تو زبان کا ٹانکا ہی ٹوٹ جاتا ہے۔"

مالک .... "آج صبح جب میں دودھ لینے کے لئے گیا تو وہاں قاسم صاحب سے ملاقات ہو گئی وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔"

مالکن .... "کیا کہہ رہے تھے قاسم صاحب ؟"

مالک .... "یہی کہ آپ کا کتا بہت بھونکتا ہے۔"

مالک .... "ادھر دو چار دن سے اس کا دماغ زیادہ خراب ہو گیا ہے ورنہ پڑ کے مزے سے سوتا تھا۔"

مالک............ "اصل میں بات یہ ہے کہ جاڑے کے موسم میں کتے زیادہ بھونکنے لگتے ہیں۔"
چنٹو............ "جاڑے کے موسم میں زیادہ کیوں بھونکنے لگتے ہیں؟"
مالک............ "بیٹے، جاڑے کے موسم میں اندھیرا بڑھ جاتا ہے اور سناٹا بھی زیادہ ہوتا ہے۔"
چنٹو............ "سب لوگ اندر جو سوتے ہیں۔"
مالک............ (خوش ہو کر) "ہاں...... اس لئے۔"
(سب لوگ ناشتہ کر چکتے ہیں مالکن برتن سمٹتی ہے پنٹو اپنے ساتھیوں کو رات والی بات بتانے باہر چلا جاتا ہے۔)

تیسرا سین

(رات کا وقت۔ سب لوگ کمرے میں سو رہے ہیں پنٹو اپنے ٹھکانے پر بیٹھا دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے اچانک دیوار پر آدمی کا چہرہ نظر آتا ہے)

پنٹو............ (نیچی آواز میں) تم آج پھر آ گئے؟

(آدمی ایک نظر پنٹو کی طرف دیکھتا ہے پھر سارے گھر میں نظر دوڑاتا ہے)

"میں پوچھتا ہوں کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ چوروں کی طرح دیوار کے پیچھے سے کیوں جھانک رہے ہو؟ میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں تم چپکے سے آکر سامان چُرا لینا چاہتے ہو۔ کل بھی اسی لئے آئے تھے اگر میں سو رہا ہوتا تو تم کچھ نہ کچھ کرشمہ دکھلا جاتے مگر تم ڈال ڈال تو میں پات پات۔ کل تمہارے جانے کے بعد ایک منٹ بھی نہیں سویا اور آج تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شام سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں اپنی ماں کا دودھ پیا ہو تو ذرا نیچے اتر کے تو دکھلاؤ۔

(چور اپنے چہرے کو زیادہ اوپر کر کے چاروں طرف دیکھتا ہے پھر پنٹو کو چمکارتا ہے)

"تم سمجھتے ہو کہ چمکارنے سے میں تمہارے قابو میں آ جاؤں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔"

(چور دیوار پر چڑھ جاتا ہے پنٹو زور زور سے بھونکتا ہے۔)

"نہیں مانو گے............ اچھا تو تمہارے پاس ہتھیار بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مالک کو جگائے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

(کمرے کے پاس جا کر زور زور سے بھونکتا ہے)

"مالک اٹھئے، جلدی اٹھئے، چور آج پھر آ گیا۔ جلدی اٹھئے۔"

مالک .... " اونہہ .... اس نے تو جینا حرام کر دیا (مالک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آتا ہے)
" تو نے آج پھر وہی حرکت کی۔ اتنی زور زور سے کیوں بھونکتا ہے ؟"
پنٹو .... " میں بلاوجہ نہیں بھونک رہا ہوں مالک، آپ ایک منٹ کے لئے باہر آکر تو دیکھئے۔"
(قلانچیں بھرتا ہوا آنگن میں، جاتا ہے اور دیوار کی طرف دیکھ کر اپنے آپ سے کہتا ہے)
" ارے، یہ تو چلا گیا۔ بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔"
(مالک سے مخاطب ہو کر) "مالک آیئے آج دروازہ کھول ہی دیجئے ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا بس پیپل کے پیڑ کے پاس پہنچا ہو گا۔ ہو سکتا ہے دیوار کی آڑ میں چھپا بیٹھا ہو، جلدی آیئے مالک، جلدی آیئے۔"
(پنٹو دیوڑھی میں جا کر پنجے دروازے پر اس طرح رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کنڈی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو)
مالک .... " حرام خور اس طرح چلاتا ہے جیسے کھانے کو نہیں ملتا۔"
پنٹو .... " میں کب کہہ رہا ہوں مالک کہ مجھے کھانے کو نہیں ملتا میں تو آپ سے یہ بتا رہا ہوں کہ ذرا دیر پہلے ایک چور دیوار کے اوپر سے گھر میں جھانک رہا تھا مگر آپ میری بات ہی نہیں سمجھ رہے ہیں۔"
مالک .... " چپ نہیں رہے گا۔"
(مالک پنٹو کے پیٹ پر زور سے لات مارتا ہے پنٹو درد سے بے چین ہو کر چلاتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف بھاگتا ہے۔)

چوتھا سین

(صبح کا وقت، مالک۔ مالکن اور چنٹو ناشتہ کر رہے ہیں پنٹو ٹکٹکی باندھے زمین پر بیٹھا ہے)
مالک .... (پنٹو کی طرف دیکھ کر) اس نے آج رات کو پھر نیند حرام کر دی۔
مالکن .... میری بھی آنکھ کھل گئی تھی ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔
مالک .... قاسم صاحب آج پھر شکایت کر رہے تھے۔
چنٹو .... پاپا! آج رات کو ہم پھر ڈر گئے تھے۔
مالکن .... آج اسے زنجیر سے باندھ دیجئے گا۔
مالک .... " زنجیر میں باندھے سے کیا فائدہ ہو گا؟ "
مالکن .... " اس طرح کمرے کے پاس تو نہیں آسکے گا۔"

مالک .... "بات تو ٹھیک ہی ہے (پنٹو سے مخاطب ہو کر) دیکھتا ہوں آج رات میں کیسے جگاتے ہو۔"

پنٹو........... (گردن کو بل دے کر) اوں۔ اوں۔ ایں .... آپ کو اختیار ہے مالک جو جی چاہے کریں۔

(سب ہنستے ہیں۔ سین بدلتا ہے)

پانچواں سین

(آدھی رات کا وقت۔ سب لوگ کمرے میں سو رہے ہیں پنٹو زنجیر میں بندھا ہوا اپنے ٹھکانے پر بیٹھا ہے اس کی نظریں دیوار کی طرف ہیں۔ اچانک دیوار پر چور کا سر نظر آتا ہے وہ پہلے گردن لمبی کر کے ادھر ادھر دیکھتا ہے پھر مسکراتا ہے)

چور........... "بہت خوب. آج تو تم زنجیر میں باندھ دیئے گئے۔"

پنٹو........... "ہاں، تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔"

(چور پنٹو کو چمکارتا ہے)

چور........... چہ چہ چہ، پیارے پنٹو!

پنٹو........... (آہستہ سے) چمکاری دو یا سیٹی بجاؤ تم کو اختیار ہے۔ میں تو اونچی آواز میں بھونک نہیں سکتا اس لئے کہ مالک کو میرا بھونکنا ناگوار لگتا ہے۔

(چور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوتا ہے)

" آج تو تم گھر میں داخل ہو گئے۔ میں زنجیر میں بندھا نہ ہوتا تو کیا تم اندر آنے کی ہمت کر سکتے تھے۔ کبھی نہیں۔ اب دیکھو کیسی سینہ زوری کے ساتھ چلتے چلے آرہے ہو، ابھی میں بھونکنا شروع کر دوں گا تو تم اچک کر دیوار پر چڑھ و گے اور ایسے غائب ہو جاؤ گے کہ جیسے یہاں تھے ہی نہیں پھر مالک بڑبڑاتے ہوئے آئیں گے اور مجھے لاتوں سے مارنا شروع کر دیں گے۔"

(چور لان میں داخل ہو کر الماری کھولتا ہے)

پنٹو...... (نیچی آواز میں) "ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہو، الماری کیوں کھول رہے ہو؟"

اب تم نے الماری سے کوئی چیز نکال کر اپنے تھیلے میں رکھ لی ہے دوسری چیزیں الماری سے نکال رہے ہو کیا سب چیزیں اٹھالے جاؤ گے۔ نہیں مانو گے ؟ کسی کے گھر میں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تم کو آخر خدا کے گھر جانا ہے یا نہیں۔ لعنت ہے تم پر۔

(پنٹو خوب اچھل اچھل کر زنجیر سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ زنجیر بجتی ہے چور خوف کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا ہوا بھاگتا ہے)

"اب کیوں ڈر گئے، ہمت ہے تو کھڑے رہو۔"

(چور دیوار پر چڑھ کر باہر چلا جاتا ہے)

چھٹا سین

(مالک، مالکن پنٹو، قاسم صاحب اور محلے کے کئی لوگ جمع ہیں سب کے چہروں پر پریشانی کے آثار ہیں)

مالکن .... (بین کرتی ہے) "ہائے ہائے۔ میں تو لٹ گئی ایک ایک چیز لے گیا ظالم۔ اب کہاں سے آئیں گی یہ سب چیزیں"

قاسم صاحب .... (مالک سے مخاطب ہو کر) "یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟"

مالک .... "پتہ نہیں، مجھے تو صبح ہی معلوم ہو سکا۔"

قاسم صاحب .... "کھٹ پٹ کی کوئی آواز آپ نے نہیں سنی؟"

مالک .... "کوئی آواز نہیں سنی۔"

قاسم صاحب .... "تعجب ہے، آپ کا کتا روزانہ تو بھونک بھونک کر زمین آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا اور جب چوری ہونے والی تھی تو اسے سانپ سونگھ گیا۔"

مالکن ...... "ہاں کم بخت آج کیسا بکٹی مارے پڑا رہا۔"

قاسم صاحب .... "بات یہ ہے کہ جب چور آتے ہیں تو اپنے ساتھ کتوں کے لئے راتب بھی لاتے ہیں یہ راتب کھانے لگا ہو گا اور اس نے اپنا کام کر لیا ہو گا۔"

مالک .... "آپ صحیح کہتے ہیں۔" (ہاتھ میں جوتا لے کر پنٹو کو دوڑاتا ہے) "کیوں بے! رات میں کیا ہو گیا تھا تجھے، کیوں نہیں بھونکا نمک حرام۔"

پنٹو .... "میں مجبور تھا مالک، مجھے نہ ماریئے، میں مجبور تھا مالک ...."

(پنٹو چیختا چلاتا اور قلانچیں بھرتا ہوا باہر چلا جاتا ہے مالک دروازہ زور سے بند کر لیتا ہے)

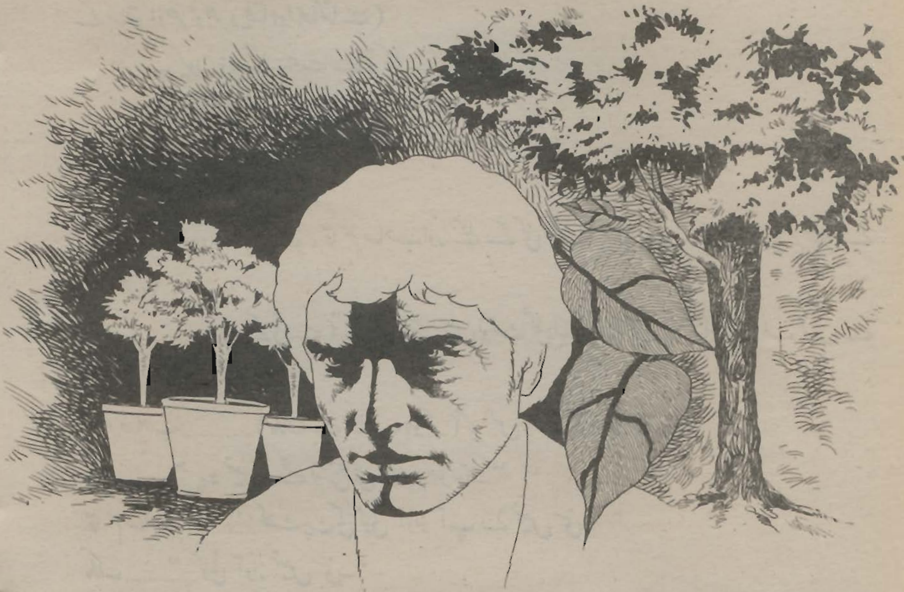

تین رنگوں والی پتیاں

تمثال مسعود (لکھنؤ بھارت)

وہ اکیلا درخت ہمارے مکان کے پچھواڑے کی طرف ایک کونے میں لگا ہوا تھا۔ میں اِس کو اُس وقت سے دیکھ رہا تھا جب میں دنیا میں آیا تھا۔ اس کا تنا موٹا تھا اور اس پر ریشوں سے جو لکیریں پڑی تھیں ان سے ایک شکل بنتی تھی جو غور سے دیکھنے پر کچھ کہتی معلوم ہوتی تھی، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ درخت میں ایک انوکھی بات یہ تھی کہ اس کا موٹا تنا زمین کے پاس بہت پتلا تھا۔ یہ بات میں نے کسی اور درخت میں نہیں دیکھی۔ تیز ہوا چلتی تو ڈر لگتا کہ درخت تنے کے پہلے حصے کے پاس سے ٹوٹ جائے گا لیکن ابھی تک وہ آندھیوں میں بھی صحیح سلامت رہا تھا۔ اس کی پتیاں بہت گہرے سبز رنگ کی اور

دوسری تمام پتیوں سے اتنی مختلف تھیں کہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ پتیاں ہیں ہی نہیں لیکن میں نے ان کی باقاعدہ جانچ کی تو ان میں کلوروفل موجود تھا۔ ان پتیوں میں صرف تین تین رگیں تھیں جن سے ان کا انوکھا پن بڑھ گیا تھا درخت کے تنے کے سرے پر بہت سی سیدھی سیدھی شاخیں تھیں جن کی موٹائی اور لمبائی یکساں تھی۔

یہ درخت ہمارے یہاں اتنے زمانے سے تھا کہ ہم سب اس سے مانوس ہو چکے تھے لیکن جب گھر میں کوئی نیا مہمان آتا اور اس کی نظر اچانک درخت پر پڑتی تو اس کی آنکھیں حیرت سے اور کبھی خوف سے پھیل جاتیں اور وہ دیر تک اس پر نظریں گاڑے رہتا پھر ہم سے اس کا نام پوچھتا جو گھر والوں میں کسی کو نہیں معلوم تھا۔

ایک بات پورے میں گھر میں صرف میں نے دریافت کی کہ درخت مکان کے ہر دروازے اور ہر کھڑکی سے دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور بات میں نے اس دن دریافت کی جب میں قریب شام اس کے نیچے میز کرسی بچھا کر اور لکھنے پڑھنے کا سامان لے کر بیٹھا تھا۔ پڑھتے پڑھتے مجھے سخت گرمی لگنے لگی اور میرا گلا سوکھ گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید دن بھر کی تیز دھوپ نے زمین کو تپا دیا ہے۔ میں نے پائپ سے درخت کے نیچے خوب چھڑکاؤ کر دیا۔ یہاں تک کہ زمین کی ٹھنڈک میرے تلووں کو اچھی معلوم ہونے لگی۔ لیکن جب دوبارہ پڑھنے بیٹھا تو مجھے پھر اسی طرح بلکہ زیادہ گرمی لگنے لگی، تب مجھے پتا چلا کہ گرمی زمین سے نہیں، درخت سے نکل رہی ہے۔ میں نے اس پر بھی دیر تک پانی ڈالا لیکن گرمی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ تھک ہار کر میں اپنے کمرے میں آ گیا جہاں گرمی سے کچھ سکون تھا۔

ذرا دیر بعد میری بیوی باورچی خانے سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے کشتی تھی جس میں چائے کی پیالیاں اور کچھ بسکٹ تھے۔ کمرے میں آ کر وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور ہم دونوں چائے پینے لگے۔ اچانک مجھے ایک جُھرجُھری آئی اور میری بیوی ہنس پڑی، پھر بولی۔

اس گرمی میں آپ کانپ رہے ہیں تو سردیوں میں کیا حال ہوگا؟"

میں چونک پڑا تو وہ اور زور سے ہنس دی۔ میں خاموش رہا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"کچھ طبیعت خراب ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا، تمہارے گلابوں کی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ اچانک اداس ہو گئی۔

"سب سوکھ گئے۔" اس نے کہا۔

کچھ دن پہلے وہ گلابوں کے کئی پودے لائی تھیں اور انہیں بڑے شوق سے کھاد اور پانی دیتی تھی

لیکن وہ مُرجھاتے چلے جارہے تھے۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھاکل میں دفتر کے مالی سے بات کروں گا۔"

تیسرے دن مالی آیااور اپنے ہاتھ سے صحن میں عمْدہ قسم کے گلاب لگا گیا۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر وہ بھی سُوکھ گئے۔ میں نے مالی کو بتایا تو وہ بہت حیران ہوا۔ میرے یہاں آکر وہ دیر تک سُوکھے ہوئے پودوں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"صاحب! آپ کے یہاں کی مٹی خراب ہے۔"

مالی کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ وہ شاید سچ کہتا تھا، اس لئے کہ ہمارے گھر میں کوئی درخت یا پودا نہیں تھا، سوائے اس درخت کے، بلکہ ہمارے یہاں برسات کی جنگلی گھاس تک نہیں اُگتی تھی۔

میری بیوی کو گلاب بہت پسند تھے اس لئے اب میں بازار سے کچھ گملے لایا اور ان میں اپنے ایک دوست کے چمن کی مٹی بھرائی۔ پھر میں نے ان گملوں میں نئے گلاب کے پودے لگائے اور دونوں وقت ان کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اس بار یہ پودے جم گئے اور ایک ہفتے کے اندر ان میں نئے کلّے پھوٹنے لگے۔ تین چار مہینے میں پودے خوب بڑھ کر گھنے ہوگئے لیکن ان میں پھول لگنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں دن میں کئی کئی بار دیر تک ان کی گھنی پتیوں میں کلیاں تلاش کرتا اور ناکام رہتا تھا۔ اب کڑاکے کی سردیاں پڑرہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک دن میں اپنے اسی دوست سے ملنے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چمن گلاب کے پھولوں سے سرخ ہو رہا ہے۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو ان کے پودوں کی پتیاں کچھ الگ شکل کی معلوم ہوئیں۔ میں نے دوست سے پوچھا۔

"کیا یہ گلاب کی کوئی نئی قسم ہے؟"

"نہیں تو" اس نے جواب دیا۔ سب سے عام قسم ہے۔"

"مگر ان کی پتیاں ایسی کیوں ہیں؟"

"پھر کیسی ہوتیں؟" وہ بولا۔ "سب گلابوں کی پتیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا میرے یہاں گملوں میں گلاب کے پودے نہیں ہیں؟ میں نے سوچا اور گھر واپس آگیا۔ میں نے گملوں والے پودوں کو غور سے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ان کے تنے موٹے لیکن نیچے سے بہت پتلے تھے اور گہرے سبز رنگ کی پتیوں میں تین تین رگیں تھیں۔ میں نے ایک گملے کو آہستہ سے اٹھایا، پودے کے تنے پر ریشوں سے بنی ہوئی ایک شکل کچھ کہتی معلوم ہوتی تھی اور گملے کی گرمی سے میرے ہاتھ جل رہے تھے۔

انعامی لطیفہ

○ ...... ایک صاحب اپنے مکان کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک فقیر نے آکر سوال کیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کہنے لگے "پھر کسی وقت آنا اس وقت گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے۔" فقیر عاجزی سے بولا "جناب تھوڑی دیر کے لئے آپ ہی آدمی بن جائیں۔"

(مرسلہ ...... کمیل شوکت۔ کراچی)

○ ...... ایک عورت بہت تیز کار چلا رہی تھی۔ اچانک اس نے سڑک کے درمیان کھڑے ٹریفک سارجنٹ کو ٹکر مار دی۔ سارجنٹ ٹکر کھا کر گر پڑا اور کراہنے لگا۔ وہ عورت شان بے نیازی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور غصے سے بولی، "اب مزا آیا سڑک کے درمیان کھڑے ہونے کا؟"

مرسلہ ...... حافظ محمد عمر، میانوالی

○ .... ○ ○ .... ○

○ ...... "صحت کے لئے ضروری ہے کہ پھل کے ساتھ ان کے چھلکے بھی کھائے جائیں۔ آپ کا پسندیدہ پھل کون سا ہے؟" ڈاکٹر نے مریض سے پوچھا۔

"ناریل۔" مریض نے جواب دیا۔

(مرسلہ ...... اکبر عبدل علی، سکھر)

○ .... ○ ○ .... ○

○ ...... ایک آدمی کی گاڑی کی بتیاں رات کے وقت خراب ہو گئیں۔ اس نے اپنی گاڑی ایک دوسری گاڑی کے پیچھے لگا دی تاکہ اس کی روشنی میں راستہ طے کر سکے۔ کچھ دور جا کر اگلی گاڑی اچانک رک گئی۔ وہ آدمی ہارن پہ ہارن دینے لگا اور چلّا کر بولا "بے وقوف آدمی تم اپنی گاڑی آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟" اگلی گاڑی والے نے بھی غصے سے جواب دیا۔ "آگے کیوں بڑھاؤں، گاڑی تو میرے گیراج میں کھڑی ہے۔"

(مرسلہ ...... کمیل شوکت، کراچی)

○ .... ○ ○ .... ○

○ ...... ایک شاعر نے مولانا جامیؒ کے اس شعر پر اعتراض کیا

بس کہ در جانِ فگار وچشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدای شو از دور پندارم توئی

یعنی تو میرے دل اور آنکھوں میں اس طرح سمایا ہوا ہے کہ دور سے ہر آنے والے کو میں سمجھتا ہوں کہ تو ہی ہے۔"

شاعر کا اعتراض تھا کہ "اگر دور سے گدھا آتا دکھائی دے تو پھر آپ کیا سمجھیں گے؟"

مولانا نے جواب دیا "میں سمجھوں گا کہ تو ہی ہے۔"

○..........○○..........○

○ ...... ایک شخص ہوٹل میں چائے پینے گیا۔ ملازم نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی مگر اس میں چمچہ نہیں تھا۔ اس نے ملازم کو بلایا اور بولا "یہ چائے بہت گرم ہے اس میں انگلی ڈال کر چینی گھولوں گا تو انگلی جل جائے گی۔ ملازم پیالی اٹھا کر لے گیا۔ "تھوڑی دیر بعد دوسری لایا اور بولا "اس میں انگلی ڈال کر دیکھئے یہ کچھ ٹھنڈی ہے۔"

(مرسلہ...... فواد کریم۔ کراچی)

○..........○○..........○

○ ...... ایک دفعہ ایک امریکی صدر اپنے جوتے پالش کر رہے تھے کہ ایک معزز آدمی ان سے ملاقات کے لئے آگئے اور حیرت سے پوچھا، "مسٹر صدر! آپ اپنے جوتے پالش کر رہے ہیں؟"

صدر نے برجستہ جواب دیا، "تو آپ کس کے جوتے پالش کرتے ہیں؟"

○..........○○..........○

○ ...... ایک شخص نے دوسرے شخص سے سوال کیا "کیا آپ کے موزوں (جراب) میں سوراخ ہیں۔"

"نہیں۔" دوسرے شخص نے جواب دیا۔

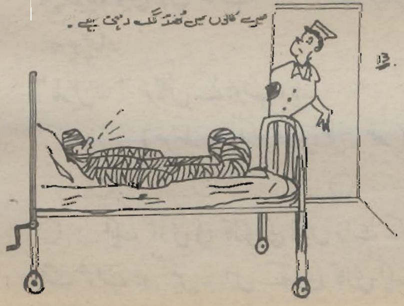

"تو پھر آپ نے پہنے کیسے؟" اس شخص نے پوچھا۔

○.......... ○○.......... ○

○...... ایک وکیل نے مؤکل سے کہا "لڑکپن میں مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا اور ڈاکوؤں کی فلمیں دیکھ کر مجھ میں ڈاکو بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔"

مؤکل نے کہا "آپ قسمت والے ہیں ورنہ ہر کسی کی خواہش کہاں پوری ہوتی ہے۔"

○.......... ○○.......... ○

○...... ایک شخص نے ڈاکٹر صاحب سے کہا، "ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

"تو پھر یقیناً تم نے میری لکھی ہوئی دوائیں وقت پر نہیں دی ہوں گی"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"وقت پر کیا! میں نے تو دی ہی نہیں۔" اس شخص نے کہا۔ "وہ کیوں۔؟" ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اس لئے کہ ان دواؤں پر خود ہی لکھا تھا کہ دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔"

(مرسلہ...... منہاج احمد خان، نارتھ کراچی)

○.......... ○○.......... ○

○...... گاہک نے دکاندار سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے جو ہاتھی دانت کی مصنوعات لے کر گیا تھا وہ سب نقلی ہیں!"

دکاندار نے معصومیت سے جواب دیا......

"جناب اگر ہاتھی نے نقلی دانت لگا رکھے ہوں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے" !!!

(مرسلہ...... مظہر حسین چشتی، خانیوال)

○.......... ○○.......... ○

○...... ایک دفتر میں ایک نئے افسر تعینات ہو کر آئے۔ انہوں نے دیکھا دفتر کی فضا لڑکوں کے ہوسٹل جیسی ہے۔ انہوں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

جواب ملا "جی کچھ نہیں۔"

ایک اور لڑکے پر نظر پڑی تو سوال کیا "اور آپ کیا کرتے ہیں؟"

پھر وہی جواب ملا "جی کچھ نہیں۔"

افسر نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا اور بولا "بہت خوب یہاں ایک ہی کام پر دو دو افراد مامور ہیں۔"

(مرسلہ...... علی فرہاد حمید)

○ ..... "خدا کا شکر ہے ہم چین میں پیدا نہیں ہوئے۔" ایک امریکن دوسرے سے بولا۔

"کیا اس لئے کہ وہ لوگ کمیونسٹ ہیں؟" دوسرے نے پوچھا۔

"نہیں ہم وہاں پیدا ہوتے تو ہمیں گونگے اور بہرے کا درجہ ملتا کیونکہ ہمیں چینی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔"

○..........○○..........○

پہلا..... آپ کا کیا نام ہے؟

دوسرا..... وہ تو میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ میری یاد داشت بہت کمزور ہے۔

پہلا..... ڈائری کہاں ہے؟

دوسرا..... یہ بھی اسی میں لکھا ہوا ہے۔

محمد جنید..... نیو کراچی

○..........○○..........○

○ ..... آٹھویں کلاس کے طالب علم ایک سائنسی نمائش کے سامنے کھڑے تھے۔ پہلا (دوسرے سے) "یہاں بتایا گیا ہے کہ آکسیجن گیس دو سو سال پہلے دریافت کی گئی تھی۔"

دوسرا (پہلے سے) "واہ! لوگ پھر اس سے پہلے کس طرح سانس لیتے تھے۔"

(مرسلہ..... محمد عادل خالد)

○..........○○..........○

باپ..... (بیٹے سے) "یہ تم مٹی میں کیا ڈھونڈ رہے ہو۔"

بیٹا..... "ابا آپ ہی نے تو کہا تھا میرا نام مٹی میں ملا ڈالا ہے۔ اسے ہی ڈھونڈھ رہا ہوں۔"

(مرسلہ: آئی اے جعفری ..... ؟)

○..........○○..........○

○ ..... ایک دیہاتی نیویارک آیا۔ وہ اپنی کار میں ففتھ ایونیو سے گزر رہا تھا کہ سرخ بتی روشن ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد سبز بتی روشن ہو گئی اور حروف چمکے "چلئے۔"

دیہاتی کار سے اُترا اور پیدل سڑک پار کر گیا۔

○..........○○..........○

تھیٹر کی ابتدا کیسے ہوئی؟

خرّم امجد کرمانی

آپ اپنے شہر میں ڈرامہ دیکھنے کے لئے یقیناً کبھی نہ کبھی تھیٹر گئے ہوں گے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ تھیٹر کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ بات یہ ہے کہ تھیٹر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مذہبی یونانیوں نے آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے تھیٹر کو متعارف کرایا۔ تھیٹر سب سے پہلے پہاڑ کے بلند حصے کو تصور کیا گیا جسے لوگ آسانی سے دیکھ سکیں۔ یہ تھیٹر پہاڑ کی تراش خراش سے کچھ اس طرح بنا ہوا ہوتا تھا کہ بیٹھنے والے نیم دائرے کی صورت میں ہوتے۔ ابتدائی دنوں میں تھیٹر میں صرف رقص پیش کیا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں یور۔پائیڈز (euripides) سوفوکلس (sophocl-es) اور انہی کی طرح چند ادبی شخصیات نے ڈرامہ لکھنے کی ابتدا کی اور اس طرح رقص کی جگہ باقاعدہ ڈرامے پیش ہونے لگے۔

جب رومیوں نے تھیٹر کو اپنایا تو انہوں نے یونانیوں کے برخلاف عمارت کے اندر قطار در قطار نشستوں کو رواج دیا۔ رومی زیادہ تر ہنگاموں سے پر ایکشن ڈرامے بناتے۔ انہوں نے ہی ماسک (ایک طرح کا نقاب) پہننے کی جدت دریافت کی۔ رومیوں نے اپنے دور میں تھیٹر کو ترقی دی۔ روم کے زوال کے بعد ۵۵۰ء تا ۱۱۰۰ء تک جب یورپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور مسلمان عروج پر تھے تو تھیٹروں کو توڑ کر اس کے پتھر عمارتوں کے لئے استعمال کئے گئے۔ اس دور میں بازی گر، گویئے اور مداری ہی ڈرامے کو آگے بڑھانے کا باعث

بنے۔

مشرق میں بتدریج تھیٹر ترقی پا رہا ہے۔ چین میں ۱۳۰۰ء اور ۱۴۰۰ء کے درمیان چھوٹے چھوٹے ڈرامے تھیٹر کے ذریعے پیش کئے جاتے رہے جنھوں نے کافی شہرت پائی۔ بھارت میں زیادہ تر کلاسیکی تھیٹر موجود ہیں جن میں زیادہ تر رقص ہی ہوتا ہے۔ جاپان میں ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء تقریباً چار سو سال نوہ (noh) تھیٹر نے بہت ترقی پائی۔

مشرقی تھیٹروں میں پسِ منظر میں سینریاں اتنی زیادہ عکاسی نہیں کر پاتیں۔ کرداروں کو اپنے کردار ادا کرنے کے لئے مقررہ حد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

یورپ میں تھیٹر کی ترقی چرچ کی تقریبات سے ہوئی۔ یہاں تھیٹروں میں مذہبی کردار ادا کر کے مذہبی کہانیوں کو پیش کیا جانے لگا۔ کہانیاں معماتی اور کراماتی ہوتی تھیں۔ معماتی کہانیاں، حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کی نزول اور احساسات و جذبات کی ترجمان ہوتی تھی۔ کراماتی ڈرامے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہوتے جن میں ان کی کرامات کو پیش کیا جاتا۔

پہلا مکمل تھیٹر رومیوں کے زوال کے بعد اٹلی میں ۱۵۰۰ء میں تعمیر ہوا۔ اس تھیٹر میں ڈرامہ کمیڈیا ڈیل (commedia dell) بہت مشہور ہوا۔ جو بعد میں پورے یورپ میں بھی مقبول ہوا۔

۱۵۶۴ء کو برطانیہ کا سب سے بڑا ڈرامہ نویس شیکسپیئر پیدا ہوا۔ اس نے ڈراموں کو بہت ترقی دی۔ پہلا برطانوی تھیٹر شیکسپیئر کی پیدائش کے تقریباً بارہ سال بعد ۱۵۷۶ء میں تعمیر ہوا۔ ان ہی دنوں میں تھیٹر میں پردے کا استعمال ہوا۔ یعنی پردہ سیمیں کے بدل جانے کے بعد منظر بھی تبدیل کر دیا جاتا اور اس طرح قدیم تھیٹروں کی جگہ جدید تھیٹروں نے لے لی۔ سب سے پہلا جدید تھیٹر کووبرگ (schouwburg) ایمسٹرڈم (amsterdam) ۱۶۳۷ء میں تعمیر ہوا۔

اٹھارویں صدی یورپ کے لئے خاص طور پر انگلستان کے لئے اچھے ایکٹروں، ڈرامہ نویسوں اور ہدایت کاروں کی صدی ثابت ہوئی۔

آج کل کے تھیٹر رقبے کے لحاظ سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بہت سے ممالک میں ان کے قومی تھیٹر ہیں جو اپنے ملک کی ثقافت کو اجاگر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ نیا تجرباتی کام بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں مغربی ممالک کے طائفے آتے ہیں جو انھیں جدید تکنیک سے روشناس کراتے ہیں۔ آج کل کے تھیٹر کا ڈرامہ نویس اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ ڈراموں میں معاشرتی برائیوں کو سامنے لایا جائے تاکہ ان کا سدِباب ہو سکے۔ ہمارے ملک پاکستان میں بھی تھیٹر مقبول ہے۔ لیکن عوام کے خاص طبقے ہی تھیٹر جاتے ہیں۔ ویسے بھی اسٹیج ڈرامے کا معیار ہمارے ہاں بہت اچھا نہیں ہے

آدابِ سفر

صفائی نصف ایمان ہے ۔ صفائی کا خیال رکھیئے ۔ ریل میں سفر کے دوران فرش پر نہ تھوکئے ۔ پھلوں کے چھلکے ادھر ادھر پھینکنے سے گندگی پھیلتی ہے جس سے نہ صرف آپ کو بلکہ دوسرے مسافروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے صحت مند اور باوقار قوموں کی طرح اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھیں ۔ یہ ریل آپ کی ہے اس کا نقصان آپ کا اپنا نقصان ہے

پاکستان ریلوے سے تعاون کیجیئے

محکمہ تعلقات عامہ

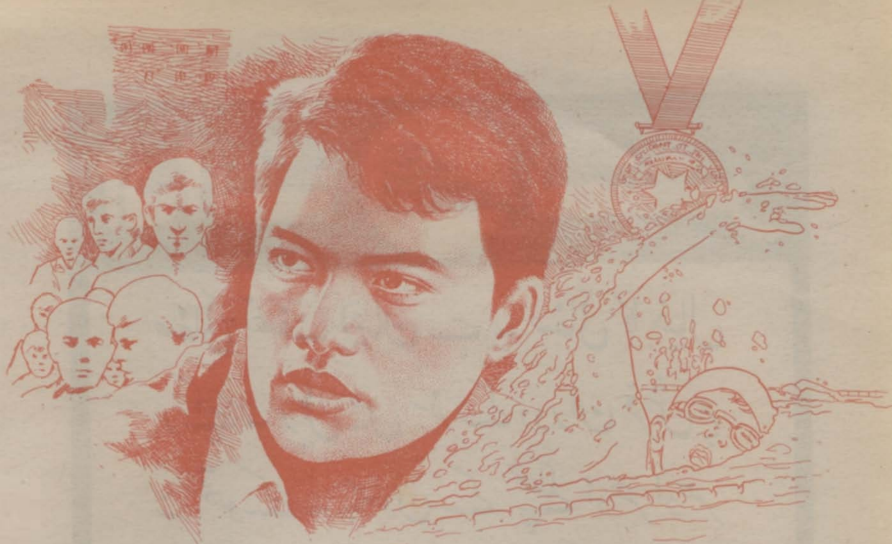

فتح

خرم معراج سید

آج بھی وہی بات ہوئی جو ہر روز کا معمول تھا۔ اس میں چانگ کی کوئی غلطی نہیں تھی، اسے جان بوجھ کر تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بے چارا چانگ خاموشی سے سب سے پچھلی ڈیسک پر جا کر بیٹھ گیا۔ امن پرستی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ سر لمٹن ابھی تک نہیں آئے تھے۔ تب ہی چارلس مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا "چیونگم کھاؤ گے؟"

"نہیں......" اس کی نظریں بدستور کتاب پر جمی تھیں۔ "چینی نسل کے لوگ چیونگم نہیں کھاتے۔" کسی منچلے امریکی نے آواز کسی اور پوری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی۔ عین اسی لمحے سر لمٹن کلاس میں داخل ہوئے۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟" "کک...... کچھ نہیں سر...... میں چانگ سے کتاب لینا چاہتا تھا۔" گھبراہٹ چارلس کے لہجے سے عیاں تھی۔ "چلو اپنی سیٹ پر............ اور چانگ...... تم یہاں کہاں بیٹھے ہو...... اپنی سیٹ سنبھالو...... ہری اپ۔" سر لمٹن کہتے گئے اور چند لمحوں میں ان کے احکامات پر عملدر آمد ہو گیا۔ کسی نے کوئی چوں چرا نہ کی۔ پوری یونیورسٹی میں وہ "دہشت گرد" کے عنوان سے جانے جاتے تھے۔ البتہ چانگ پر ان کی خاص عنایتیں تھیں پچھلے سمسٹر میں جب چانگ نے پوری فیکلٹی

میں ٹاپ کیا تو سر لمٹن نے بے اختیار چانگ کو گلے لگا لیا تھا۔
چانگ گو چینی نسل سے تعلق رکھتا تھا تاہم وہ اپنے آپ کو امریکی تہذیب میں مدغم کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ وہ چین میں ہی پیدا ہوا تھا مگر جب اس کے والد کا تبادلہ امریکہ میں موجود چین کے سفارت خانے میں بحیثیت کوآرڈینیٹر ہوا تو اسے بھی یہاں امریکہ آنا پڑا۔ امریکی، چینیوں کے بارے میں صاف ستھری رائے نہ رکھتے تھے مگر وہ اپنی دُھن کا پکا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ حکومت چین نے اس کے والد کو چینی سفارت خانے میں مستقل تعینات کیا ہے لہٰذا اب یہی ملک اس کا وطن تھا۔ پہلے دن جب وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو لاتعداد نگاہوں کو اس کے وجود کا طواف کرتے ہوئے پایا گیا۔ پہلا سمسٹر کاٹے نہ کٹتا تھا۔ چارلس کنگ اور اس کے ہمنوا شاید چینیوں سے بے پناہ بغض رکھتے تھے، چانگ کی تضحیک اور اسے نقصان پہنچانے کا ہر جائز و ناجائز طریقہ انہوں نے اپنا رکھا تھا مگر یہ خدا کی رحمتوں کے بادل اور اساتذہ کی خصوصی عنایات ہی تھیں جنہوں نے چانگ کو ہر بلا سے محفوظ رکھا۔
اس روز چارلس زیادتی کی حد سے گزر گیا جب اس نے بلیک بورڈ پر "وی کین ناٹ ایکسیپٹ چائنیز ڈاگس" لکھ دیا اور تھامس، ڈیوڈ اور جوزف کے ہمراہ "چینی کتے ہائے ہائے" کے نعرے بھی لگائے۔ اس موقع پر تھامس نے تقریر بھی کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ چینیوں نے امریکیوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے ہیں، چین امریکہ کا ایٹمی پروگرام بند کرانے کی سازش میں برابر کا شریک ہے، لہٰذا ان ظالم چینیوں کا امریکی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔" سول ڈیزائنر فیکلٹی میں چانگ واحد غیر ملکی تھا۔ ہر قسم کی زیادتیوں کے باوجود کوئی حرف شکایت اس کے لبوں پر نہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ معاملہ وہ اپنے والد کے سامنے پیش کرے تو یہ مسئلہ بین الاقوامی سطح پر دونوں ملکوں میں سخت کشیدگی کا سبب بن سکتا تھا۔ چانگ ہمیشہ اپنے سخت اصولوں پر کاربند رہا۔ منزل کا حصول اور لگن اس کا متعینہ ہدف تھا۔
چانگ کی ذہانت کے تو سب ہی معترف تھے مگر چانگ نے "اسپورٹس ویک" میں "سوئمنگ" میں اپنا نام لکھوا کر سب ہی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ حتمی انتخاب سے پہلے ٹرائلز میں یہ حقیقت سب پر عیاں ہو چکی تھی کہ چانگ ایک بہترین تیراک بھی ہے۔ وہ دن چانگ کی زندگی کا کالا دن تھا جب جوزف کی ایک زیادتی پر چانگ نے ایک بھرپور طمانچہ اس کے بائیں گال پر رسید کر دیا۔ پھر تو ایک زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یونیورسٹی کی دیگر فیکلٹیز۔۔۔ کے غیر ملکی بھی امریکیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ نفرتوں کا طوفان لاوے کی صورت میں پھٹ پڑا۔ مجبوراً وی سی کو پولیس طلب کرنا پڑی۔ لاس اینجلس کی اس یونیورسٹی میں شاذ و نادر ہی ایسے واقعات رونما ہوئے تھے۔ تمام دن چانگ پر اداسی چھائی رہی۔ پوری یونیورسٹی میں چانگ کے خلاف شر انگیز چاکنگ کر دی گئی تھی اور امریکی طلبہ کی جانب سے عرض داشت بھی

پیش کر دی گئی، تب ہی، وائس چانسلر نے اسے اپنے دفتر طلب کیا۔

"مسٹر چانگ............ تم جانتے ہو کہ تم کس کے بیٹے ہو۔"

"یس سر............ چینی سفارت خانے کے اہم اہلکار کا۔" وہ وی سی کے فقروں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہاری کسی حرکت پر دونوں ممالک کے تعلقات کشیدہ ہو سکتے ہیں۔"

"جی ہاں سر۔" اس نے اپنی گردن جھکالی۔

"شاید تم نہیں جانتے کہ بعض طلبہ نے چینی حکومت کو عرض داشت بھیجی ہے جس میں چینی حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ چینی سفارت خانے سے مسٹر مار کنگ یعنی تمہارے والد کو واپس بلایا جائے...... کیونکہ وہ اور ان کا بیٹا مسٹر چانگ لاس اینجلس یونیورسٹی میں مبینہ دہشت گردی اور معصوم طلبہ کو زخمی کرنے میں ملوث ہیں اور دونوں ممالک کے تعلقات خراب کرنا چاہتے ہیں............ میں چاہتا تو تمہیں ابھی اور اسی وقت یونیورسٹی سے نکل دیتا...... مگر نسلی تعصب پر میں یقین نہیں رکھتا............ تمہارا پچھلا شاندار ریکارڈ دیکھ کر مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم بھی ایسی حرکت کر سکتے ہو۔" وائس چانسلر نے ایک لمبی تمہید باندھ دی۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ واقعی خطرناک تھا۔ چانگ کو اسی بات کا خدشہ تھا اسی لئے اس نے یونیورسٹی میں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھایا تھا۔

"آئی ایم سوری سر............ دیٹس مائی بلیک ڈے آف لائف...... آپ مجھے جو سزا دیں گے، مجھے قبول ہو گی۔" وہ بدستور زمین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"اچھا اچھا...... اوکے...... اب غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... اب تم نے اپنی غلطی مان لی ہے تو آئندہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جو تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے پشیمانی کا باعث بنے۔"

حقارت کی ایک لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ "کس قدر کم ظرف ہے یہ وائس چانسلر۔" اس کے معصوم دل نے سرگوشی کی اور وہ دماغ جھٹکتا ہوا باہر نکل آیا۔

اسپورٹس ڈے کا آغاز بیس بال سے ہونا تھا اور چانگ نے تو اس کھیل کا نام ہی پہلی بار سنا تھا۔ یہ کھیل اسے کرکٹ سے مشابہہ معلوم ہوا جو اس نے چائنیز ٹیلی ویژن کے چینل ۴ پر دیکھا تھا جو ہمسایہ ملک پاکستان میں کھیلا جا رہا تھا۔ اگلے دن سوئمنگ کے مقابلوں کا آغاز تھا۔ غیر ملکی طلبہ کی یونین "آس" نے چانگ سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھی۔ یونین کے صدر رنجیت سنگھ اور نائب صدر عامر ملک نے مقابلوں کے آغاز سے پہلے چانگ سے کہا تھا۔ "چانگ...... اگر تم یہ مقابلہ ہار گئے تو

سمجھ لو ہم غیر ملکی بھی حوصلے ہار گئے...... تمہاری فتح حق کی فتح ہوگی۔" جواب میں چانگ نے اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ غیر ملکی طلبہ کی یونین نے مقابلے کے موقعے پر بے شمار غیر ملکیوں کو جمع کیا تھا تاکہ چانگ کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ چانگ انڈرویئر میں ملبوس سوئمنگ پول کے لان میں داخل ہوا اور دل کی دھڑکنیں.... واضح طور پر محسوس کی جانے لگیں، رنجیت سنگھ نے "بھگوت گیتا" پکڑ رکھی تھی اور عامر قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے اور کھلاڑی بھی لان میں داخل ہوئے۔ تھامس ان میں سب سے نمایاں تھا، چوڑے چکلے جسم اور چھریرے بدن کا مالک تھامس سوئمنگ کے کئی مقابلوں میں فتحیاب ہو چکا تھا۔ چانگ کو نمبر ۶ اور تھامس کو نمبر ۵ الاٹ کیا گیا تھا۔ یہ دو چکروں کا ایک راؤنڈ تھا؛ مجموعی طور پر چار راؤنڈ مکمل کرنے تھے۔ فائر کھلا اور تالیوں کی آواز دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ پہلے راؤنڈ میں سول ڈیزائنز فیکلٹی کا جوزف سب سے آگے رہا۔ تمام ہی طلبہ کے دل فضا میں معلق تھے۔ رنجیت چیخ رہا تھا۔

"شاباش...... ہمت کرو چانگ...... ہماری "آس" کو مت توڑو۔" ان الفاظ نے چانگ کے جسم میں بجلیاں سی بھر دیں، اگلے راؤنڈ میں جوزف پیچھے رہ گیا اور چانگ اور تھامس آگے نکل گئے عین اسی موقع پر تھامس کا سر پانی کی لہروں پر موجود لوہے کے گارڈر سے ٹکرایا۔ چانگ نے تھامس کو دیکھ لیا۔ تمام کھلاڑی آگے نکل گئے تھے، کسی کو تھامس کی پروا نہیں تھی۔ رنجیت چلّا رہا تھا۔ "پاگل ہوئے ہو چانگ...... اس خبیث کو چھوڑو...... آگے نکلو...... آگے۔" مگر چانگ رُکا رہا، وہ تھامس کا سر پکڑے ہوئے تھا، جو تکلیف سے بری طرح مچل رہا تھا۔ مقابلے کے ضابطوں کے مطابق کھیل روکنا ناممکن تھا لہٰذا کھیل جاری رہا اسی اثنا میں جوزف نے چوتھا راؤنڈ مکمل کر کے مقابلہ جیت لیا اور تمام کھلاڑی بھی پول سے باہر آگئے مگر چانگ تھامس کے ہمراہ پہلے ہی باہر موجود تھا۔ غیر ملکی طلبہ کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ تھامس کے سر کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ اس موقعے پر عامر آگے بڑھا، "یار چانگ...... تم نے غیر ملکی طلبہ کا وقار اس سوئمنگ پول میں ڈبو دیا۔"

"چانگ نے تو تمہیں نیا وقار دیا ہے۔" وائس چانسلر پروفیسر گرین مسکراتے ہوئے آگے بڑھے، انہوں نے چانگ کا ہاتھ تھاما اور اسے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا، امریکی اور غیر امریکی طلبہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی چانگ اور کبھی پروفیسر گرین کو دیکھتے رہے، وہ چانگ کے گلے میں تمغہ ڈالتے ہوئے بولے۔ "یہ چانگ کی نہیں، تمام انسانیت کی فتح ہے، چانگ وکٹری اسٹینڈ پر نہیں، انسانیت کی معراج پر کھڑا ہے۔"

بہ خدمت جناب

راحت صلاح الدین، کراچی۔ آنکھ مچولی پھر بازی لے گیا۔ یقین جانئے بہت خوشی ہوئی۔ ستمبر کے شمارے میں فرزانہ روحی کی کہانی "عظیم لڑکا"، عمر احمد خان کی کہانی "گڑیا" اور طاہر مسعود کی "فائز کھول دو" بہت پسند آئی۔ سلیم مغل بھائی کے رسالے سے رخصت ہوجانے پر دکھ ہوا۔ سال بھر پہلے "آنکھ مچولی" میں میری کتاب پر تبصرہ چھپنے کے بعد ستمبر و اکتوبر کے شماروں میں خطوں کے کالم میں اسما پاشا اور عائشہ احمد کے خط نظر سے گزرے تھے۔ جنہوں نے مجھ سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں ان دونوں دوستوں کا دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ ضرور تھامنا چاہوں گی۔ ○ ...... اسما پاشا اور عائشہ احمد، راحت صلاح الدین صاحبہ سے آنکھ مچولی کے معرفت رابطہ قائم کر سکتی ہیں۔

شازیہ یعقوب، ضلع نارووال۔ مجھے قصے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں لیکن افسوس کہ کسی بھی ادارے کو ارسال نہ کر سکی۔ ○ ...... آپ کی تحریریں ہمیں مل گئی ہیں۔ لکھنے کے لئے مشق اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کوشش جاری رکھئے۔ **محمد فیصل عزیز خان شیروانی، کراچی۔** کشمیر نمبر پر اول انعام حاصل کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ ستمبر کا شمارہ بہت ہی شاندار ہے۔ خاص طور پر "فائز کھول دو" اور "کنبہ" بہت پسند آئیں۔ **محمد محسن، نواب شاہ۔** پہلے "آنکھ مچولی" کو صرف میں پڑھتا تھا، مگر اب میری باجیاں اور بھائی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ **مریم، (؟)** ۔ کشمیر نمبر کے لئے آپ کی کاوش واقعی قابلِ دید تھی۔ محنت کا صلہ تو ضرور

ملتا ہے۔ **آمنہ پرویز، لاہور۔** جو تحریر میں آپ کو بھیجتی ہوں، وہ میں دوسرے رسالوں کو بھی بھیج سکتی ہوں؟
○ ......جی نہیں! ایک تحریر ایک ہی رسالے کو بھیجنی چاہئے۔ **محمد شریف ظفر، کنگن پور۔** سہیل احمد صدیق کا مضمون "بوسنیا میں مسلمانوں کا خون کب تک بہتا رہے گا؟" پڑھ کر دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ یقین مانئے پڑھتے ہوئے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ **عمران شفیع، کراچی۔** ستمبر کا سرورق دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ شمارہ لاجواب ہو گا۔ خاص طور پر "فائر کھول دو"، "گڑیا" اور "وہ ٹھیک کہتا تھا" کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ محترمہ سیما صدیقی کا مضمون "اللہ بچائے" بھی بہت اچھا لگا۔ پہیلیوں کا سلسلہ جاری رکھئے۔ **عمر ریاض، جہلم۔** آنکھ مچولی کو اول انعام ملنے کی مبارکباد۔ تمام کہانیاں اور لطائف دلچسپ تھے۔ میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی اسی طرح ہر سال چمک جایا کرے۔ **محمد یونس، بولان۔** ستمبر کے شمارے میں "نشانِ حیدر"، "نیلے آکاش کے اس پار"، "عظیم لڑکا" اور "قائداعظم کے آخری لمحات" بہت پسند آئے۔ **اسما کرن چوہدری، نارووال۔** میں چھ یا سات سال کی تھی، اسی وقت سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ اب میں اسی دسمبر میں پندرہ سال کی ہو جاؤں گی۔ اب جبکہ میں بڑی ہو گئی ہوں، تو مجھے یہ رسالہ پڑھتے یا خریدتے وقت لوگ حیرانگی سے دیکھتے ہیں کہ آپ بچوں والے رسالے پڑھتی ہیں۔ اور مجھے یہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ ایسے احمقانہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کی سب سے اچھی کہانی مجھے "پناہ" لگی تھی۔ اور اب "کرشمہ"۔ ○ ...... آنکھ مچولی دوستی نبھانے پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ **آغا فاروق احمد، جیکب آباد۔** "پاکستان کوئز" کی آخری تاریخ آپ نے جو ۱۲ ستمبر مقرر کی تھی، لیکن افسوس کہ آپ نے نتائج کا اعلان اگست کے شمارے میں کر دیا۔ یہ وعدہ خلافی آپ نے کیوں کی؟ ○ ......اسی سلسلے میں ہمیں بہت سے خطوط ملے ہیں۔ ایسا غلطی سے ہو گیا۔ اس کے لئے آپ سب کو جو کوفت ہوئی اس کے لئے ہم آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہیں۔ **محمد مشتاق، راولپنڈی۔** میں ہر ماہ رسالہ بڑی خوشی سے لیتا ہوں اور اسے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس میں بڑی خوبصورت کہانیاں ہوتی ہیں۔ میرا مشغلہ آنکھ مچولی پڑھنا ہے۔ **قیصر محمود عباسی، مانسہرہ۔** کیمرے کی قرعہ اندازی میں امیدوار ہوں۔ کیا خیال ہے مک مکانہ ہو جائے؟
○ ......بھئی یہ بات تو چپکے سے کرنے کی تھی، آپ نے تو سارا راز ہی فاش کر دیا۔ اب مک مکا کیسے ہو سکتا ہے۔ ؟ **الیاس اختر انصاری، لطیف آباد۔** غالباً "امی ابو کا صفحہ" کی روایت اردو رسالوں میں آنکھ مچولی ہی نے ڈالی ہے۔ اسے نہ صرف جاری رہنا چاہئے بلکہ دیگر رسائل کو بھی اس کی پیروی میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ ○ ...... یہ صفحہ آنکھ مچولی کے اجرا کے ساتھ شروع کیا گیا تھا، اب ہم یہی مشورے کسی اور انداز میں دیا کریں گے۔ اس کے لئے انتظار فرمائیے۔ **محمد سعید گلاب، کورنگی کراچی۔** بھائی جان! آخر آپ آنکھ مچولی کا "سائنس نمبر" کب نکالیں گے؟ میں تو انتظار کر کر کے کانٹا ہو گیا ہوں۔ اگر مزید انتظار کرایا تو "سائنس نمبر" کے بجائے "صحت نمبر" نکالنا پڑے گا۔ ○ ...... انشاء اللہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اب آپ خوش ہو جائیے۔ اس بار اعلان کر دیا گیا ہے۔
محمد اکرم، کھاریاں۔ مجھے اپنے دوستوں کو بتاتے ہوئے فخر محسوس ہوا کہ میرے جان سے پیارے رسالے نے پہلا انعام حاصل کیا۔ **شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم۔** میں نے کم و بیش گیارہ تحریریں بھیجیں مگر افسوس ابھی تک ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوئی۔ انکل! کیا ہم آپ کی نظر میں اتنے ہی غیر اہم ہیں؟ ○ ......ہمیں بھی افسوس ہے۔ اب آپ کوئی

اچھی سی تحریر بھیجئے۔ **عدنان یونس چوہدری، رحیم یار خان۔** آپ رسالے میں اسلامی سوالات کا سلسلہ شروع کیجئے۔ اسی طرح بچوں کی اسلام کے بارے میں معلومات بڑھے گی۔ ○ ...... اسلامی موضوعات پر باقاعدگی سے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ پھر بھی آپ کی تجویز پر غور کیا جائے گا۔ **عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ۔** ہم کتنی محبت سے آپ کو خط اور تحریریں بھیجتے ہیں۔ اور آپ کس بے دردی سے اپنی ردی کی ٹوکری کی زینت بنا دیتے ہیں۔ ○ ...... کسی بھی تحریر کو ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے ہمیں خود دکھ ہوتا ہے۔ لیکن چھاپ دیں تو پڑھنے والوں کو دکھ ہوگا۔ **آصف حیات، پشاور۔** ستمبر کا شمارہ ملا۔ جی خوش ہوگیا۔ سرورق لاجواب، کہانیاں لاجواب، لطیفے لاجواب، ہر چیز لاجواب۔ ○ ...... آپ کا خط پڑھ کے ہم بھی لاجواب ہوگئے۔

محمد فیصل میمن، حیدر آباد۔ آپ سرورق پر کارٹون کے بجائے بچوں کی تصویریں دیا کریں۔ **محمد محسن اعظم، مظفر آباد کشمیر۔** ستمبر کے شمارے میں نیلوفر امان کا خط شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب کشمیر پاکستان کا پانچواں صوبہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہوتی ہیں کشمیر کو پانچواں صوبہ کہنے والی؟ کشمیر کا فیصلہ اسی دن ہوگا جس دن کشمیر آزاد ہوگا۔ ○ ...... نیلوفر امان کو کشمیر سے بھی محبت ہے اور پاکستان سے بھی۔ اسی لئے انہوں نے یہ بات لکھی۔

ناصر علی، پھل جی اسٹیشن۔ رسالے میں طب کے بارے میں کوئی ایسا سلسلہ شروع کیجئے جس میں کوئی ڈاکٹر یا حکیم صاحب طب کے بارے میں سوالوں کے جواب دیا کریں۔ **ط۔م طاری، فیصل آباد۔** آنکھ مچولی کے بازی لے جانے پر بہت خوشی ہوئی۔ دعا ہے کہ آنکھ مچولی مزید ترقی کرے۔ **عبدالحفیظ شاہد، خانیوال۔** ستمبر کے شمارے میں "تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا"، "نشانِ حیدر"، "انسانی جسم" اور "درِ حیرت" نے معلومات میں بہت اضافہ کیا۔ **عائشہ صدیقی بگوتی، سرگودھا۔** ویڈیو میگزین آج ہی ملا ہے، بہت شکریہ۔ مگر میں اسے دیکھ نہیں سکتی۔ کیونکہ ایک تو ہمارے گھر میں وی۔سی۔آر نہیں اور دوسرے میرے امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ **شبیر کمال زئی، کراچی۔** آپ کا تحفہ دینے کا انداز پسند آیا۔ امید ہے آپ اس تحفے کو کسی ایسے پڑھنے والے کو دیں گے جو اسی کا حقدار ہوگا۔ ○ ...... فیصلہ قرعہ اندازی سے ہوگا۔

محمد شفیق، چیچہ وطنی۔ اپنے محبوب رسالے میں ایک کشمیری بھائی کا خط پڑھ کر افسوس ہوا ...... کشمیری بھائی تو خود پاکستان کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ خدانخواستہ ہم کیوں آپ لوگوں کی خودمختاری کو ختم کریں گے۔ **ممتاز علی سورج میمن، ٹھٹھہ۔** حیرت ناک تصویر نے بہت ڈرایا۔ کہانیوں میں "عظیم لڑکا" اور "وہ ٹھیک کہتا تھا" بہت پسند آئیں۔ **حافظ محمد عثمان، کراچی۔** اس بات کی بے حد خوشی ہوئی کہ آنکھ مچولی اس دفعہ بھی اول آیا۔ سید کاشان جعفری کو میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ **اعجاز احمد، قیصر، فیصل، بلدیہ ٹاؤن کراچی۔** ستمبر کے شمارے میں راجہ عابد حسین صاحب کا موقف پڑھ کر انتہائی دکھ ہوا۔ انہیں کشمیر کی خودمختاری کی بات کرنے سے پہلے کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں پاکستان کا کردار ذرا غور سے دیکھنا چاہئے تھا کہ پاکستانی قوم نے کشمیر کے لئے مال و زر سے ہی نہیں عملی طور پر بھی بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ **ارشد علی آرائیں، شکارپور۔** ستمبر کے شمارے میں اداریہ بہت پسند آیا۔ "فائر کھول دو"، "عظیم لڑکا" اور "گمنام شہید" یہ تینوں کہانیاں بے حد اچھی تھیں۔ لیکن سرورق یومِ دفاع کے حوالے سے مناسب تھا۔

جادو کا رسالہ

دفتر سے گھر آیا تو حریمہ بیگ کہنے لگیں! "ابو، یہ آنکھ مچولی تو جادو کا رسالہ معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا، "کیسے بیٹی؟"

"دیکھیے نا، میں اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھتی ہوں تو یہ امی کی الماری سے ملتا ہے۔ اپنے بستے میں رکھتی ہوں تو یہ بھنی کی کاپیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر واپس لا کر اپنی میز پر رکھتی ہوں تو تھوڑی دیر بعد منے کے کھلونوں کے درمیان دیکھتی ہوں اب آج کی بات ہی سن لیجئے۔ رات میں نے اسے سنبھال کر اپنی کتابوں کے نیچے رکھا تو صبح آپ کے دفتر جانے کے بعد یہ آپ کے سرہانے سے ملا...... ہے نا جادو کا رسالہ؟"

میں مسکرا دیا۔ "ہاں بیٹی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اس میں کچھ ایسا ہی جادو چھپا ہوا ہے۔"

کیا خیال ہے آپ کا......؟ کیا میں حریمہ بیگ کے مشاہدے کی تردید کر سکتا تھا؟

مظفر بیگ

مدیر ماہنامہ "آئین" لاہور۔

ہمیں ان ساتھیوں کے خطوط موصول ہوئے

محمد یونس حسین، کراچی۔ شبانہ حنیف، ٹنڈو آدم۔ سید محمد علی شاہ، نیو کراچی۔ محمد عاقل احمد خان، پرانا سکھر۔ فہیم عزیز، لانڈھی، کراچی۔ معظم اختر، لاہور۔ ساجد حبیب عزیز، کراچی۔ محمد ادریس قریشی، گجرات۔ شاہنواز گل، مردان۔ اعجاز احمد، گجرات۔ جویریہ صدیقی، ملیر، کراچی۔ ماہین رضوی، نارتھ کراچی۔ رفیع اللہ سواتی، ضلع سوات۔ محمد عثمان بلوچ، کراچی۔ اسد سردار احمد قریشی، سکھر، سندھ۔ راشد منہاس ثاقب، ضلع قصور۔ محبوب عبدالرزاق، کراچی۔ جمیل احمد، رحیم یار خان۔ ثروت صدیقی، کراچی۔ سید ثقلین شاہ کھو کھرائی، حیدر آباد۔ محمد علی، کراچی۔ ستارہ انجم شیخ، ٹنڈو آدم۔ جاوید اقبال شنراد، ضلع میانوالی۔ اعجاز حسین، لاہور۔ سرمد ملک، آزاد کشمیر۔ غلام عباس طاہر، شور کوٹ۔ نعیم احمد نور، پسنی۔ اشفاق مغل، لاہور۔ محمد اکرم، جلال پور جٹاں۔ سہیل اکرم خان، ایبٹ آباد۔ ایم اسلم خان، مظفر گڑھ۔ ہارون اشرف، میر پور آزاد کشمیر۔ محمد شنراد خان، لانڈھی، کراچی۔ کمال ایوب صدیقی، ملتان۔ زاہدہ، حیدر آباد۔ وحید عامر، بوریوالہ۔ محمد اسلم جاوید، راولپنڈی۔ محمد عثمان سلیم، لاہور۔ محمد جاوید اقبال رضا، خانیوال۔ شبر علی چنگیزی، لاہور۔ مہا سواتی، اسلام آباد۔ سیما صدیقی، کراچی۔ ہارون رشید، گجرات۔ نائمہ ظفر، لاہور۔ نعیم نہال، کراچی۔ مبشر علی زیدی، کراچی۔ یاسر فاروق، راولپنڈی۔ مختار احمد، پشاور۔ سعید صفدر کراچی۔ محمد انعام فاروقی، اسلام آباد۔ محمد یوسف، گوجرانوالہ۔ طیبہ نثار چیمہ، گجرات۔ رابعہ شمیم، کراچی۔ آمنہ معظم بٹ، لاہور۔ عدیل اسلم، گوجرانوالہ کاشف قدیر، ڈیرہ اسماعیل خان۔ منصور احمد، ضلع بھکر۔ شوکت جاوید، کراچی۔ ظل ہما، پشاور۔ کنول بشیر گجرات۔ عالیہ فاروقی، وہاڑی۔ محمد نوید اکرم، لطیف آباد، حیدر آباد۔ حزب اللہ خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مجاہد حسین باسط، اوکاڑہ۔ ممتاز قریشی، ٹھٹھہ۔

اُڑان

ذیشان بن صفدر

موسم گرما کی تعطیلات اپنا نصف سے زیادہ سفر طے کر چکی تھیں اور اس تمام عرصے میں وقاص اور سلمٰی نے نہ صرف اپنا سارا ہوم ورک نمٹا کر رکھ دیا تھا بلکہ اپنے گھر کی لائبریری میں موجود تمام کتابوں کا مطالعہ بھی کر چکے تھے اور اب ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تعطیلات کے باقی ماندہ ایام کیسے گزاریں۔ شہر کے تمام تفریحی مقامات ان کے پہلے ہی دیکھے بھالے تھے بلکہ وہ ان مقامات کو اتنی مرتبہ دیکھ چکے تھے کہ اس کی گنتی بھی انہیں یاد نہیں رہی تھی۔ ہاں گھر میں ابو جان کے کمرے کی ایک الماری ایسی تھی جس میں ان کے اپنے دور طالب علمی کی پرانی کتابیں اور ان کے زمانے کے قدیم رسائل محفوظ تھے امی جان اس الماری کی طرف جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں دیتی تھیں اور خود اس پر سختی سے نظر رکھتی تھیں۔ وقاص اور سلمٰی نے مل کر آپس میں پروگرام بنایا کہ اگر تعطیلات کے ان باقی دنوں میں اس الماری کو

کھول کر ۔ دیکھا گیا تو سمجھو کچھ کیا ہی نہیں۔ بڑی سوچ بچار کے بعد سلمیٰ کے ذہن میں تجویز آئی ان کی امی جان ہر ماہ کے آغاز میں ابو جان کو تنخواہ ملنے کے بعد گھریلو اشیا کی خریداری کے لئے بازار جاتی ہیں۔ کیوں نا اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ وقاص بہن کی اس تجویز پر پھڑک اُٹھا...... "واہ...... واہ...... واہ...... کیا شاندار آئیڈیا ہے' اس نے سلمیٰ کو اس کی اس شاندار تجویز پر خراج تحسین پیش کیا اور پھر اس پر عمل کے لئے خود بھی جی جان سے تیار ہو گیا۔

تین دن کے انتظار کے بعد آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب امی جان گھریلو ضرور توں کی فہرست مرتب کر کے بازار گئیں۔ اب وہ تین، چار گھنٹے سے پہلے گھر واپس لوٹنے والی نہیں تھیں۔

وقاص نے اسکریو ڈرائیور کی مدد سے الماری کی کنڈی اس طرح کھول لی کہ تالا جیسا کا تیسا اپنی جگہ لگا رہا...... الماری کھولنے کے بعد تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ الماری میں ابو جان کے دورِ طالب علمی کی کتابیں ہی نہیں ان کے اپنے سائنسی آلات اور دوسری سائنسی کتب و میگزین بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر انہیں یاد آیا کہ ابو نے کبھی اپنے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ وہ سائنس کے بڑے اچھے طالب علم تھے اور خود بھی نت نئے تجربات میں مصروف رہتے تھے، جبکہ ان کے ابو جان یعنی وقاص اور سلمیٰ کے دادا جان کی خواہش تھی کہ وہ بڑے ہو کر ان کا کاروبار سنبھالیں اور پھر دادا کی ہی خواہش پوری ہوئی۔ ابو نے اپنے شوق کی قربانی دی اور دادا جان کا کاروبار سنبھال لیا۔

اسی الماری کے ایک خانے میں خوبصورت عقاب کی صورت میں ایک آبنوسی کرسی رکھی ہوئی تھی یہ کرسی طالب علموں والی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی طرف کاپی رکھ کر نوٹس لکھنے کے لئے بنی ہوئی جگہ پر ایک کمپیوٹر نصب تھا۔ کمپیوٹر کے ساتھ بنے ہوئے شیلف میں ایک لفافے میں کچھ ڈائیگرام اور ایک سائنسی رسالہ بھی رکھا ہوا تھا۔ وقاص نے جھٹ لپک کر وہ ڈائیگرام اور رسالہ ہاتھ میں لے لیا۔ جیسے ہی اس نے ڈائیگرام کو ہاتھ لگایا کچھ حُرف سے ایک دم چمکنے لگے پھر وہ صرف ایک عبارت کی شکل میں سامنے آگئے، لکھا ہوا تھا۔ "یہ ایگل کمپیوٹر ہے، اسے چلانے اور استعمال کرنے کی ترکیب ان کاغذات میں درج ہے۔"

سلمیٰ اور وقاص دونوں ہی جیسے باز نما کرسی میں دھنس گئے اور اسی کرسی پر بیٹھ کر ڈائیگرام دیکھنے لگے۔ کمپیوٹر میں ایک جگہ مائیک لگا ہوا تھا اور قریب ہی ایک بٹن لگا تھا اس کے نیچے مستقبل کا لفظ درج تھا۔ سلمیٰ نے مائیک کے قریب اپنا منہ لے جا کر دھیرے سے کہا "مجھے بازار کا منظر دکھاؤ جہاں امی خریداری کرنے گئی ہیں اور ساتھ ہی وہ بٹن بھی دبا دیا۔ فوراً ہی اسکرین پر انہیں بازار نظر آنے لگا۔ دکانوں پر خریداری کا ہجوم، ریڑھی والے، جنرل اسٹور، ٹی اسٹور، کراکری شاپ، سلی دکانیں،

ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ پھر ایک جگہ منظر ساکت ہو گیا۔ وہ ایک کپڑے کی دکان تھی ۔ کئی خریدار دکان کے سامنے رکھے اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ان ہی میں ایک اسٹول پر اس کی امی بھی کپڑا دیکھ رہی تھیں۔ یہ کپڑا وہ سلمیٰ کی یونیفارم کے لئے ہی پسند کر رہی تھیں۔ اب وقاص نے مائیک کی طرف جھک کر کہا، میرے ابو کے آفس کا منظر دکھاؤ اور فوراً ہی اسکرین پر بازار کی جگہ اس کے ابو کا آفس نظر آنے لگا۔ ابو اپنے کمرے میں بیٹھے تھے اور ایکسپورٹ منیجر کو ضروری ہدایات دے رہے تھے جس کے بعد وہ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ اکاؤنٹ چیک کرنے لگے۔

"ارے یہ تو بے مثال ایجاد ہے، ابی کی...... کاش دادا جان انہیں کاروبار میں نہ لگاتے تو وہ بہت بڑے اور کامیاب سائنسدان ہوتے۔" وقاص نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" سلمیٰ نے جواب دیا۔"شائد امی اسی لئے کسی کو بھی اس الماری کی طرف آنے نہیں دیتی...... خیر چلو، ہم اسے یہاں سے نکال کر اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔ تم الماری پہلے ہی کی طرح بند کر دو تاکہ کسی کو بھی اس بات کا شبہ نہ ہو کہ ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔"

اپنے کمرے میں واپس آکر سلمیٰ نے کہا، بھائی میرے ششماہی امتحان ہو چکے ہیں، کمپیوٹر سے معلوم کریں کہ اس کا رزلٹ کیا ہے...... وقاص نے مائیک پر رزلٹ بتانے کا حکم دے کر بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی اسکرین پر ایک شبیہ ابھر آئی۔ یہ سلمیٰ کی اسکول کی وائس پرنسپل اور ایگزامینیشن انچارج مس عباب تھیں۔ ان کے چاروں طرف مختلف کاپیوں کے بنڈل بندھے رکھے تھے۔ رزلٹ شیٹیں بھی ایک طرف گڈی کی صورت میں نظر آرہی تھیں ۔ مس عباب کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چشمہ تھا۔ جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک عبارت ظاہر ہوئی، لکھا ہوا تھا۔
"بچو! مس عباب کا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ آج رزلٹ مکمل نہیں کر سکیں گی۔ آپ دو دن اور انتظار فرمائیں۔"

اب وقاص نے اپنے دوست طارد کے گھر کا منظر دیکھنا چاہا، اور فوراً ہی اسکرین پر طارد کے گھر کا منظر اُبھر آیا۔ طارد اپنے کمرے میں بیٹھا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ اس سے پہلے کہ منظر بدلتا، سلمیٰ کا ہاتھ اچانک بے خیالی میں کسی بٹن پر پڑ گیا...... ارے یہ کیا...... دونوں ہی حیرت سے کُرسی کو دیکھنے لگے۔ وہ اِیگل نما کرسی کمرے میں سے نکل کر باہر صحن میں گئی تھی اور اب اس نے فضا میں اوپر اُٹھنا شروع کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک تو دونوں بھائی بہن سہمے اور خوفزدہ سے رہے۔ مگر جب وہ اِیگل چیئر بلند ہونے کے بعد

خود بخود ہی ایک طرف کو پرواز کرتی آگے بڑھنے لگی تو انہیں ہوش آیا۔ سلمٰی نے فوراً مائیک کی طرف منہ کر کے سوال کیا۔ "اے کرسی...... یہ کیا حرکت ہے...... تم ہمیں کہاں لے جا رہی ہو......" کمپیوٹر کی اسکرین پر عبارت نمودار ہوئی۔ لکھا تھا۔ "تم نے کرسی کو اُڑانے والا بٹن دبایا تھا۔ اب یہ کرسی اڑ رہی ہے۔ تم پہلے ہی کی طرح جیسے حکم دو، اور جہاں جانا چاہو اسے لے جا سکتے ہو۔" سلمٰی یہ سن کر خوش ہو گئی اور خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ بھائی...... یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ چلو ہم فن لینڈ، پلے لینڈ، وغیرہ گھوم کر آتے ہیں۔" راستے میں ان کی نظر قائد اعظم کے مقبرے پر پڑی۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں رکھے شو پیس کے برابر نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں سب گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے گھر لگ رہے تھے...... وہ اپنے ابو کے اس سائنسی کارنامے پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش بھی تھے۔

اچانک ایگل چیئر پر لگے کمپیوٹر میں سے بب، بب کی آوازیں آنے لگیں۔ اور اسکرین پر سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی۔ دونوں نے اسکرین کی طرف توجہ کی تو وہاں یہ اطلاع درج تھی کہ ہمارا ایندھن ختم ہونے والا ہے، ہم ایک پلازہ کی چھت پر اتر رہے ہیں۔

"مگر...... مگر ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟" دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ اگر آپ گھر پہنچنا چاہتے ہیں تو اب اسے انسانی قوت سے چلا کر گھر لے جا سکتے ہیں۔ اس کرسی کے ساتھ جو بیٹری نصب تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔ اور ایگل چیئر بلندی سے نیچے کی طرف آنے لگی۔ جہاں ایک زیر تعمیر پلازہ کی وسیع اور کشادہ چھت تھی۔ سلمٰی نے گھبرا کر کہا "بھائی...... جلدی کرو۔ ڈائیگرام میں دیکھو، انسانی قوت کس طرح استعمال کی جا سکتی ہے۔" وقاص نے فوراً ڈائیگرام دیکھا۔ پھر کمپیوٹر سے نکلے ہوئے تاروں پر نظر ڈالی اور انہیں دی گئی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی کلائیوں سے باندھ لیا۔ عمل مکمل ہوتے ہی کرسی اوپر اٹھنے لگی اور ایک مخصوص بلندی پر پہنچنے کے بعد آگے کی طرف سفر کا آغاز کر دیا۔ اب دونوں بھائی بہن مطمئن ہو کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

دونوں کو بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے صبح کا ناشتہ ہی کیا ہوا تھا۔ الماری دیکھنے کی دُھن میں، دوپہر کا کھانا کھانا، بھول گئے تھے۔ وقاص نے مائیک کے قریب منہ لے جا کر مکس فروٹ چاٹ کا آرڈر دیا۔ اور ساتھ میں خوش ذائقہ مٹھائیوں کا بھی۔ لمحے بھر ہی میں سجی اور بھری ہوئی ٹرے ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے ایک ایک پلیٹ ہاتھ بڑھا کر ٹرے میں سے اٹھالی...... مگر یہ کیا...... ان کے ہاتھ اکڑ گئے تھے۔ وہ کہنیوں پر سے مڑ نہیں پا رہے تھے۔ اور بغیر کہنیاں موڑے وہ کھانے کی کوئی بھی چیز اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ وقاص نے کمپیوٹر سے سوال کیا، یہ کیا ہوا میرے ہاتھوں کو...... ہمارے

ہاتھ کیوں اکڑ گئے ہیں۔ اسکرین پر عبارت نمودار ہوئی۔ انسانی قوت کھینچ کر چونکہ کرسی کو اُڑانے میں صرف ہو رہی ہے اس لئے آپ کی جسمانی قوت معطل ہے، جب تک آپ کی قوت بحال نہیں ہوگی آپ کے اعضا کی اکڑن برقرار رہے گی۔ وقاص کی آنکھیں بے چارگی کے احساس سے بھر آئیں۔ بھوک کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اس موقع پر سلمیٰ کی ذہانت نے پھر اپنا کام دکھایا۔ وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ "مل گئی...... مل گئی۔" "کیا مل گئی......؟" وقاص نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ترکیب...... کھانا کھانے کی ترکیب...... ایسا کرتے ہیں تم اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاؤ، اور میں اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاتی ہوں۔" اور پھر اس نے چمچہ بھر فروٹ سلاد وقاص کے منہ میں انڈیل دی اور یوں دونوں نے اپنی کہنیاں موڑے بغیر اپنے پیٹ بھر لیا۔

کھانے کے بعد انہوں نے پانی کی فرمائش کی...... تو جواب ملا "سائنس داں نے اس میں مشروبات کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا ہے۔"

دونوں کے منہ چاٹ کی تیز مرچوں سے بُری طرح جل رہے تھے۔ دونوں بے بس تھے سلمیٰ نے تھوڑی دیر سوچا اور فوراً ہی آرڈر دیا کہ کچھ موسمبی، مالٹے، کینو، یا فروٹر وغیرہ ہی مل جائیں اور اس کے بات ختم ہوتے ہی ایک بڑی پلیٹ میں بڑے بڑے سرخ مالٹے رکھے ہوئے سامنے آ گئے اور یوں دونوں نے اپنی پیاس بُجھائی۔

اچانک وقاص نے سوچتے ہوئے کہا، "سلمیٰ۔ کیوں نا ہم گھر واپس چلیں، ابھی تو یہ کرسی ہماری قوت سے ہی پرواز کر رہی ہے ، ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ بھی دھوکا دے جائے اور ہم نیچے گر پڑیں اور ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔" پھر وہ گھر کی طرف مُڑ کر پرواز کرنے لگے۔ گھر کی چھت پر پہنچتے، پہنچتے انہیں محسوس ہوا جیسے ان کی ساری قوت ختم ہو چکی ہے۔ کرسی لڑھکنیاں کھاتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے گر رہی ہے۔ اور وہ بچاؤ، بچاؤ...... کہہ کر چلانے لگے۔

اور پھر انہیں ہوش نہ رہا۔

وقاص کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا امی اس کے اوپر جُھکی ہوئی آوازیں دے رہی ہیں۔ "وقاص...... وقاص...... آنکھیں کھولو......" اور وقاص نے آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھا۔ وہ اپنی کرسی سے نیچے گرا ہوا تھا اور ایک طرف سائنس میگزین کے ورق پھڑپھڑا رہے تھے۔

کوہِ فوجی

سہیل احمد صدیقی

اپان میں یوں تو بہت سے پہاڑ ہیں مگر جاپانیوں کے نزدیک کسی پہاڑ کو کوہ فوجی جیسی اہمیت حاصل نہیں۔ تین ہزار سات سو چھہتر (۳۷۷۶) میٹر بلند کوہِ فوجی جسے جاپانی فوجی ساں کہتے ہیں، جاپان کا بلند ترین پہاڑ ہے۔

ساں کا لفظ محترم کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

اس کی حسین مخروطی کون جیسی ساخت اسے اس کے گرد و پیش سے ممتاز کرتی ہے اور یہ موسموں کی تبدیلی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ قدیم دور سے جاپانی اس دلکش یادگارِ فطرت کی زیارت کرتے رہے ہیں اور اسے ایک عام پہاڑ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

کوہِ خوجی کا ذکر جاپانی منظومات کے قدیم ترین تذکرے مان یوشو، جو آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، میں بھی ملتا ہے۔ یہ پہاڑ بے شمار ادبی شہ پاروں اور تصاویر کا موضوع بنتا رہا ہے۔ ان شہ پاروں میں شامل تسو شیکا ہوکوسائی کی شاندار تصنیف ''کوہِ فوجی کے چھتیس (۳۶) مناظر'' کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ یوکیوئی طرز کے لکڑی کے بلاکس پر چھپنے والی اس کتاب میں کوہِ فوجی کے مناظر اور ہوکوسائی کے دور کے لوگوں کے طرزِ زندگی کی بڑی واضح نقشہ کشی کی گئی ہے۔ درحقیقت کوہِ فوجی کی سادہ

ساخت ہی فنکار کے تخیل کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہے۔ کوہِ فوجی پر ابھری ہوئی سادہ مخروطی لکیریں سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس کی آتش فشانی کے نتیجے میں سخت اور مضبوط ہو چکی ہیں۔ جاپان کی تاریخ کے تحریری شکل میں آغاز سے اب تک اس پہاڑ کی تیرہ مرتبہ آتش فشانی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ پہاڑ پہلی مرتبہ ۷۸۱ء میں پھٹا تھا۔ کوہِ فوجی کی آخری آتش فشانی ۱۷۰۷ء میں ہوئی جو بہت زیادہ ہنگامہ خیز تھی۔ اس حادثے میں لاوے کی ایک بڑی مقدار نے ایدو (موجودہ ٹوکیو) کے قصبے تک نقصان پہنچایا۔ جو یہاں سے ایک سو کلو میٹر دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس موقع پر آتش فشاں پھٹنے سے اس کا مادہ فضا میں پھیلا تو اس قدر اندھیرا چھا گیا کہ لوگوں کو دن میں بھی اپنے لیمپ جلانے پڑے۔ ۱۷۰۷ء کی اس تباہی کے بعد کوہِ فوجی پر سکون اور خفتہ (یعنی سویا ہوا) آتش فشاں بن گیا۔

جب کوہِ فوجی پوری طرح فعال تھا تو اس کا مادہ فضا کو آلودہ کر دیتا اور اس کا سرخ گرم لاوا شام کے وقت آسمان کو روشن کر دیتا تھا۔ قدیم جاپانیوں کے لئے کوہ فوجی قدرت کا ایک پر جلال مظہر تھا۔ پہاڑ کی پر جوش طبیعت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لوگوں نے یکے بعد دیگرے عبادت گاہ بنانا شروع کر دیں جہاں کوہِ فوجی کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ سنجن نامی ان عبادت گاہوں کی تعداد ایک ہزار تین سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ٹوکیو (سابقہ ایدو) کے باشندوں میں یہ کہاوت اب بہت مشہور ہو چکی ہے۔ "وہ شخص ایدو کا اصل باشندہ نہیں جو زندگی میں ایک مرتبہ بھی کوہِ فوجی پر نہ چڑھا ہو۔"

جاپان کے ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ پہاڑ کی عبادت اور "فوجی کو" (عبادت کا انتظام کرنے والی تنظیمیں) کا سلسلہ رفتہ رفتہ ماند پڑتا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کوہ فوجی کی سیر کے لئے تعمیر کی جانے والی دو سڑکوں نے واقعی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ان شاندار شاہراہوں سے گرد و پیش کا ایک حسین منظر دیکھنے میں آتا ہے اور لوگ ٹوکیو سے فوجی تک تین چار گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ چوٹی پر جانے میں مزید چار پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ "فوجی کو" ختم ہو گئی ہیں، کوہِ فوجی پر چڑھنا خصوصاً موسم گرما میں (جولائی اور اگست کے مہینوں میں) ایک دلچسپ مشغلہ بن چکا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ایک ہفتے میں تیس ہزار افراد اس کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پچھلے دور کی مشقت اور چڑھائی کے چیلنج کے لحاظ سے اب ایک نئی کہاوت بولی جاتی ہے جو کچھ یوں ہے۔ "جو شخص کوہِ فوجی پر نہ چڑھا ہو، بے وقوف ہے مگر جو اس پر چڑھتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہے۔"

کوہ فوجی موسم سرما میں بہت زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جب کہ اس کا درجۂ حرارت منفی تیس درجے سینٹی گریڈ سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ چوٹی کے گرد برف نیلگوں اور پھسلواں ہو جاتی ہے اور قطع نظر اس کے کہ کوہ پیما کس قسم کا کوہ پیمائی سامان استعمال کرتا ہے، اس برف کے آر پار جانا

تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر سال کوہ پیماؤں کی (فوجی کی) برف پر ٹھٹھر کے یا پھسل کے مر جانے کی کافی خبریں ملتی ہیں۔ ۳۲ سالہ یوکیواویاماجو ایک فوٹو گرافر ہے اور دس سال سے اس پہاڑ کی تصویر کشی میں مصروف ہے، کہتا ہے۔ "جب آپ موسم سرما میں تنہا کوہ فوجی پر چڑھیں تو جتنا آپ اوپر جائیں گے، آپ کا خوف بڑھتا جائے گا اور آپ خود کو زبردست دباؤ کا شکار محسوس کریں گے۔ نہیں..... فوجی ساں کوئی معمولی پہاڑ نہیں ہے۔"

جوڑے بنائیے

آپ کے پاس صرف دس سیکنڈ ہیں۔ تصویر میں دی گئی شکلوں کے جوڑے بنائیے اور ان کی تعداد بتائیے

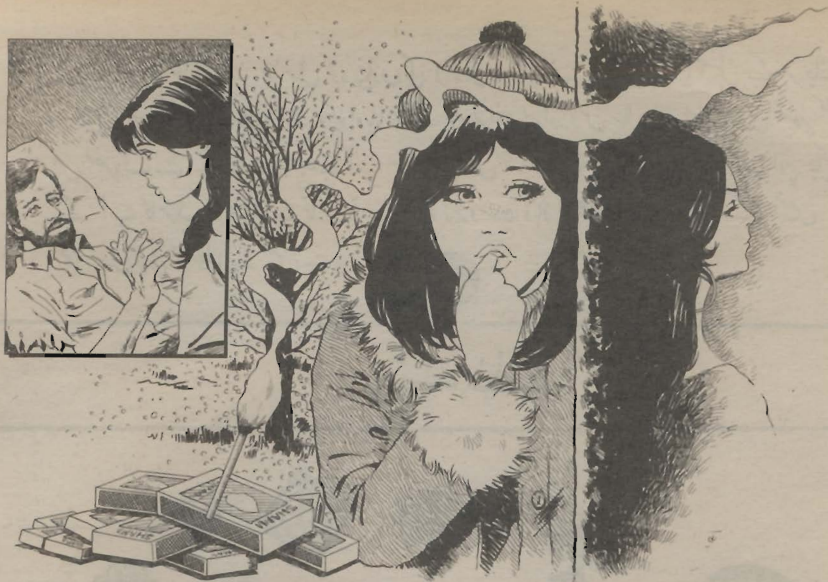

لالی

محمد علی انصاری

سری نگر کی وادی میں گیت گنگناتی اور ماچسیں بیچتی وہ بچی سب ہی کو بھاتی تھی۔ سنہری بالوں اور گلابی رنگ سے مزین وہ بچی قدرت کا شاہکار معلوم ہوتی تھی۔ سری نگر کے سرد موسم کی وجہ سے وہ اپنے سبز فراک پر بالوں والا سرخ کوٹ پہنا کرتی تھی اور ایک چھوٹی سی ٹوکری اس کی پشت سے لٹکی رہتی تھی جس میں وہ مختلف ماچیں رکھتی تھی۔ وہ کچھ ہی دنوں سے سری نگر کے بازاروں میں نظر آنے لگی تھی، ورنہ اس سے پہلے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بازار سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کی سریلی آواز کہ جس میں وہ سریلے گیت گنگناتی تھی۔ اور ساتھ ساتھ وہ یہ آواز بھی لگاتی تھی کہ "ماچس لو بھئی ماچس" اور راہ گیر رک رک کر اسے دیکھتے اور ماچس خرید لیا کرتے تھے، چاہے انہیں ماچس کی ضرورت ہو نہ ہو وہ اس بچی کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ بعض راہ گیر تو پیار سے اس کے گالوں میں چٹکیاں بھر لیتے تھے۔ جس پر وہ ہلکے سے منہ بناتی اور پھر مسکرانے لگتی تھی۔

سری نگر کے اس چھوٹے سے گاؤں میں بس ایک ہی بازار تھا جس میں وہ ماچسیں بیچا کرتی تھی۔

اور پورے بازار میں ہر دکاندار اسے جانتا تھا، کیوں کہ وہ گاؤں کے ایک شخص گل خان کی بیٹی تھی جو کہ دکانوں پر ماچس سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس معصوم سی اور پیاری بچی کا نام لالہ گل تھا لیکن ہر کوئی اسے "لالی" کے نام سے پکارتا تھا۔ جب سے اس کا بابا گل خان سخت بخار میں مبتلا ہو کر بستر علالت پر پڑا تھا تو لالی نے ماچسیں بیچنا شروع کر دی تھیں۔ گل خان نے اپنی اس آٹھ سالہ بچی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اس نے لالی کو اجازت بھی اس وجہ سے دے دی کہ بازار زیادہ دور بھی نہیں تھا اور لالی کی جھونپڑی سے بازار تک ایک پگڈنڈی جاتی تھی۔ جب لالی چھ ماہ کی تھی تو اس کی ماں نے ایک طوفانی رات میں دم توڑ دیا تھا۔ لیکن گل خان نے اسے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ لالی اکثر بازار سے واپس لالہ زرک خان کے ساتھ آتی تھی جو بازار میں لسی کے ڈبے فروخت کیا کرتا تھا اور گل خان کا جگری دوست بھی تھا۔ شہر سے دوائیاں بھی وہی لاتا تھا تاکہ گل خان کا علاج ہو سکے۔ راستہ میں لالی زرک خان سے اس کی بہادری کے قصے سنتی تھی جب وہ حریت پسندوں کے گروپ میں شامل تھا۔ ان قصوں کے عوض وہ لالہ زرک خان کو اس کا پسندیدہ گیت سناتی تھی جو اس نے قادر جان کے چائے کے کھوکھے میں سنا تھا۔ وہ گیت لالی کو اتنا پسند آیا تھا کہ وہ اس نے یاد کر لیا تھا اور اکثر زرک خان کی فرمائش پر وہ گیت سناتی تھی کہ

"یہ میری وادی پربتوں کی شہزادی"

گھر آکر وہ اپنے بابا کو کھانا دیتی جو کہ زرک خان بازار سے خرید کر دے جایا کرتا تھا۔ پھر اپنے بابا کا سر دباتی اور اپنی ماں کے قصے سنتے سنتے وہ اپنے باپ کی چھاتی پر سر رکھ کر سو جاتی۔

کچھ دنوں سے کشمیر میں برف باری شروع ہو گئی تھی اس وجہ سے مختلف شہروں سے لوگ جنت نظیر کشمیر کی سیر کو آتے تھے، اور جو بھی اس سخت سردی میں سرخ کوٹ پہنے سفید سفید برف پر ایک بچی کو ماچس بیچتے ہوئے دیکھتا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے قدرت نے برف میں سرخ گلاب کھلا دیا ہو۔ ہر کوئی اسے قریب سے دیکھنے کے لئے ماچس بھی ضرور خریدتا تھا۔ کچھ دنوں سے برف باری اپنے زوروں پر تھی۔ صبح جب لالی اٹھی تو اس کے بابا کی طبیعت کچھ زیادہ ناساز تھی۔ اسی وجہ سے وہ ماچسیں بیچنے بھی نہیں گئی اور آج لالہ زرک خان بھی اسے بلانے نہیں آیا تھا۔ شاید آج طوفان آنے والا تھا اس لئے زرک خان نے بھی دکان کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

شام کو سرد ہواؤں نے آندھی کی صورت اختیار کر لی، اور پھر بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے گل خان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ لالی نے اپنے بابا کی حالت بگڑتے دیکھی تو گھبرا گئی اور اس کا ننھا سا دل کانپ کر رہ گیا۔ اس کے بابا نے آنکھیں موند لیں تھیں۔ جب وہ لالی کے

جگانے سے نہ اٹھا تو لالی نے اپنے بابا کو جھنجھوڑ ڈالا وہ اپنے باپ کی لاش سے چمٹ گئی اور پھوٹ کر رونے لگی۔ اچانک اسے لالہ زرک خان کا خیال آیا جو کچھ فاصلے پر ندی کے پل کے پاس رہتا تھا۔ وہ زرک خان کو بلانے کے لئے بھاگی طوفانی ہوائیں اس پھول سی بچی کو اڑا کر لے جانے کی کوشش میں لگی رہیں، لیکن اس بچی کے عزم کے آگے کچھ نہ کر سکیں۔ وہ زرک خان کی جھونپڑی کے قریب پہنچی اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ ایسی ہی ایک طوفانی رات میں اس کی ماں نے بھی دم توڑ دیا تھا۔ تو کیا بابا بھی؟ .... ؟ نہیں! نہیں! اسی خیال کے ساتھ وہ دروازے کو اور زور سے کھٹکھٹانے لگی، لیکن طوفانی شور، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج کی وجہ سے دروازے کی کھٹ کھٹ کی آواز زرک خان تک نہ پہنچ سکی۔

وہ واپس پلٹی اور گرتی پڑتی اپنی جھونپڑی میں آئی۔ اس کے تمام بال بکھرے پڑے تھے۔ اس کا باپ جو کہ اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس سے لپٹی، روئی چیخی چلائی، چلا چلا کر اس نے اپنے بابا کو جگانا چاہا۔ اس نے اپنے بابا کی لاش کو جھنجھوڑ ڈالا لیکن جب اس کی آہ وبکا کا اس کے بابا پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ ناامید ہو گئی۔ اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی، کیوں کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بابا اب اس سے کبھی نہیں بولے گا۔

وہ چیختی ہوئی باہر نکل گئی۔ باہر طوفان بھی اپنے زوروں پر تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا کہ جس میں وہ اپنے گیتوں سے لوگوں کو محفوظ کیا کرتی تھی اور لوگ اپنے دکھ درد بھول کر اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے تھے لیکن آج کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے دکھ میں شریک ہوتا اسے گلے لگاتا۔

چلتے چلتے اسے ایک جھونپڑی دکھائی دی جسے طوفانی ہواؤں نے کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ سرد ہوا سے اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ طوفانی ہوائیں آہستہ آہستہ بالکل رک گئیں لیکن برف باری میں پھر بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس اندھیری طوفانی رات میں وہ احساسات سے عاری ہو کر سیاہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ جب اس نے اپنے آس پاس نظر ڈالی تو ہر طرف سفید برف بکھری پڑی تھی اور چنار کے سرسبز درخت سیاہ بھوتوں کی مانند لگ رہے تھے۔ اسے آہستہ آہستہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بھینچ لیں۔ اچانک اسے اپنی ماچسوں کا خیال آیا کہ شاید ان کی روشنی اسے خوف سے نجات دلا دے۔ اسے اپنے سرخ کوٹ سے چند ماچسیں مل گئیں۔ اس نے تمام ماچسوں کو برف پر بکھیر دیا اور ایک مڑی تڑی ڈبیا کے مصالحے سے انہیں جلانے لگی کافی تگ و دو کے بعد ایک تیلی جل بھی جاتی تو ایک ہوا کا جھونکا اسے بجھا دیتا۔ آخر وہ رو دی اس نے ہمت پھر بھی نہیں ہاری اور پھر ماچس جلائی تو آنکھوں کو چندھیا دینے

والا شعلہ پیدا ہوا، اس شعلے میں اس نے اپنی ماں کو دیکھا کہ ایک عورت بازو پھیلائے آنکھیں نم کئے اسے سینے سے چمٹا لینے کی منتظر تھی۔ لالی بے اختیار اس سے چمٹ گئی اور روتے روتے اپنی ماں کے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح نمودار ہوئی تو ایک سوگوار دھند گاؤں کی پوری وادی پر چھائی ہوئی تھی اچانک ایک معصوم بچی کا ہیولا سا دھند کو چیرتا ہوا نمودار ہوا جو کہ اپنی سریلی آواز سے فضا میں ترنم بکھیر رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پربتوں کے اس پار چلا گیا۔ اب لالی کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی اور وہ وہی گیت گنگنا رہی تھی جو وہ گایا کرتی تھی۔

میری وادی ہے پربتوں کی شہزادی

فضائی میزبان

امریکہ کی مس ایلن چرچ، ہوابازی کی تاریخ میں اس لحاظ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی کہ وہ دنیا کی پہلی فضائی میزبان (ایئرہوسٹس) تھیں۔ انہوں نے یہ میزبانی ۱۵ مئی ۱۹۳۰ء کو یونائیٹڈ ایئرلائنز کے ایک بوئنگ اے ۸۰ طیارے میں انجام دی تھی۔

مس ایلن چرچ، اس شعبے میں آنے سے پہلے نرسنگ سے وابستہ تھیں۔ انہوں نے کوئی ایک ماہ پہلے یونائیٹڈ ایئرلائنز کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہوائی جہاز کے مسافروں کی خدمت کے لئے کسی خاتون کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایئرلائن نے نہ صرف ان کی تجویز کو پسند کیا بلکہ انہی سے یہ خدمت انجام دینے کی درخواست بھی کر ڈالی۔ یوں ۱۵ مئی ۱۹۳۰ء کو ہوا بازی کی تاریخ میں "مس ایلن چرچ" نے دنیا کی پہلی فضائی میزبان ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

اس کے بعد ایلن چرچ نے مزید فضائی میزبانوں کا انتخاب کیا۔ اور سات مزید نرسیں اس شعبے سے وابستہ ہو گئیں۔ اس انتخاب کی شرائط میں ۲۵ سال سے کم عمر اور ۱۱۵ پونڈ سے کم وزن بھی شامل تھا۔ ان فضائی میزبانوں کی تربیت کے فرائض بھی ایلن نے انجام دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان میزبانوں کے لئے یونیفارم بھی خود ڈیزائن کی۔

ایئر فرانس دنیا کی پہلی فضائی کمپنی ہے جس نے بین الاقوامی پروازوں کے لئے خواتین فضائی میزبانوں کی خدمات حاصل کیں۔ یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔

"سوئس ایئر نے ۱۹۳۴ء میں، "کے ایل ایم نے ۱۹۳۵ء "لفتھانسہ نے ۱۹۳۸ء میں ایئر فرانس کی تقلید کی، آج دنیا کی ہر فضائی کمپنی میں خواتین فضائی میزبانوں کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

مرسلہ...... علی جبران - مخدوم پور پہوڑاں

آنکھ مچولی البم

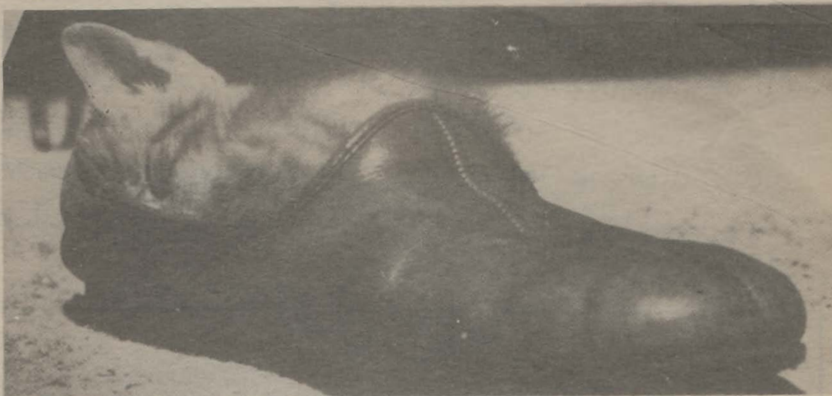

نیند اور آرام کی
ضرورت جانوروں
کو بھی ہوتی ہے۔ جس
طرح انسانوں کو بستر
نصیب نہ ہو تو وہ فٹ پاتھ
اور پارکوں میں بھی سو
جاتے ہیں کچھ یہی حال
جانوروں کا بھی ہے سونے
کے لئے جگہ نہ ملے تو شیر
درخت پہ اور بلی جوتے
میں سو جاتی ہے۔
یورپ میں کتوں کے
بہت عیش ہیں۔
بیچارہ بچہ مسہری
کے نیچے پڑا ہے اور
کتے میاں بستر پہ
محو خواب ہیں۔
ہے نا بری
بات!

کون کہتا ہے شیر کو درخت پہ چڑھنا نہیں آتا !

صفر کی واپسی

زاهد منان قریشی

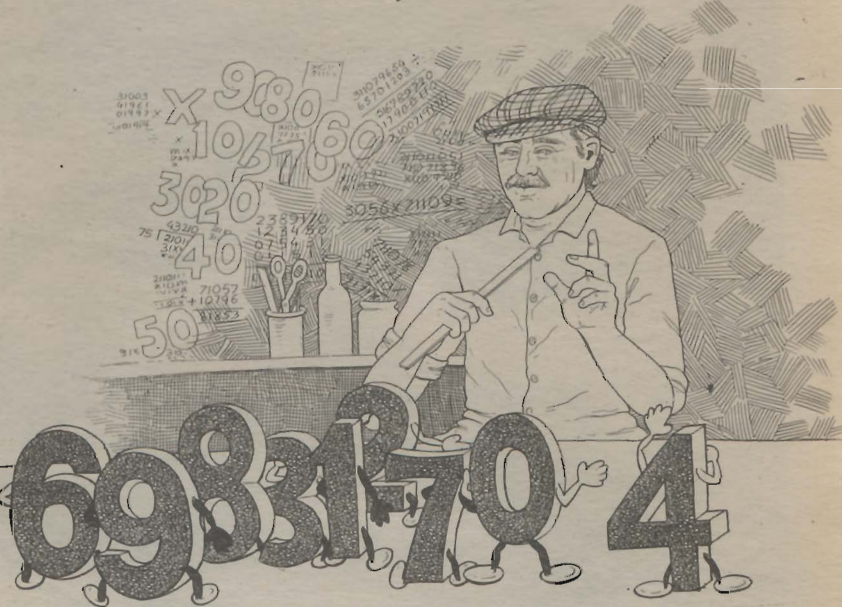

پیارے دوستو! صفر سے تو آپ سب واقف ہیں یہ ہمارے ہندسوں میں سب سے اہم عدد ہے۔ آیئے ہم آپ کو اس کی کہانی سناتے ہیں۔

ایک ریاضی دان سب سے الگ تھلگ جنگل میں کچھ ہندسوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جنہیں وہ صفر، ایک دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ اور نو کے نام سے پکارتا تھا۔ وہ ہندسوں کی مدد سے کچھ نئے ہندسے بنانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ صبح کئی گھنٹوں تک ان ہندسوں کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ اور ان سے نئے نئے سوالات تیار کرنے کی کوشش کرتا۔ چھٹی کے بعد سب ہندسے مل کر کھیلتے تھے۔ یوں تو وہ بہت اچھے تھے لیکن وہ صفر کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے کیونکہ صفر کی کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ سب اس

کا مذاق اڑاتے اور اس سے جھگڑتے۔ صفر چاہتا تھا کہ وہ سب کے ساتھ مل کر رہے مگر وہ اسے اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ بڑے ہندسے تھے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی پیاری اور چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ریاضی دان آج کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا اس لئے سب ہندسے مل کر کھیل رہے تھے۔ صفر کا جی چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر کھیلے اس لئے وہ ان میں جا کر شامل ہو گیا۔

"ارے! یہ تم صبح ہی صبح اپنی منحوس صورت لیکر کہاں آگئے ہو۔" پانچ نے منہ بنا کر کہا۔

"میں..... میں تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔" صفر نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا!! تم ہمارے ساتھ کھیلو گے؟" آٹھ حیران رہ گیا۔ "چلو بھاگو یہاں سے۔" اس نے رعب سے ڈانٹ کر کہا۔

"مگر میں بھی آپ جیسا ہی ہوں..... آٹھ بھائی! آپ بھی تو دو صفروں سے مل بنے ہیں۔"

صفر نے ڈرتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر تو آٹھ آگ بگولہ ہوگیا۔ فوراً مارنے کو لپکا مگر دوسرے ہندسوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

"چلو چلو بھاگو یہاں سے۔" سات نے صفر سے کہا۔

"ہاں! ہاں صفر! تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔" دو نے ہمدردی سے کہا۔

صفر نے پرامید نظروں سے نو کی طرف دیکھا۔ کیونکہ وہ سب ہندسوں سے بڑا تھا، اور سب پر اس کا رعب تھا مگر اس نے بھی صفر کی کوئی مدد نہ کی۔ "چلو جاؤ اور اب آئندہ کبھی ہم سے کھیلنے نہ آنا۔ اپنی اوقات تو دیکھو۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔" نو نے زہر خند لہجے میں کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ دوسرے ہندسے بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ صفر اکیلا رہ گیا۔ اس کا دل بھر آیا۔

"سب نے اس کی کتنی بے عزتی کی ہے۔" اس نے سوچا "آج ریاضی دان گھر پر نہ تھا اسی لئے ایسا ہوا اگر وہ ہوتا تو ان کی یہ مجال کہ مجھ سے ایسا سلوک کرتے اور "ایک" بھی تو کچھ نہیں بولا۔ بڑا دوست بنتا ہے۔ دیکھ لیا سب کو..... کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ سب میرے دشمن ہیں۔ سب میری بے عزتی کرتے ہیں۔ میں بہت دور چلا جاؤں گا۔" یہ خیال آتے ہی صفر جنگل کی طرف چل دیا۔

کافی دور جانے کے بعد جب اس کو تھکن کا احساس ہوا تو وہ ایک جھاڑی میں لیٹ کر سو گیا۔ شام کو

اس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس کا جی چاہا فوراً واپس چلا جائے مگر پھر اپنی بے عزتی کا خیال آتے ہی اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ "ہاں میں واپس نہیں جاؤں گا۔" اس نے ہٹ دھرمی سے سوچا۔

اسے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر جنگل میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ وہ وہیں چھپا رہا۔ اور نہ جانے کب سو گیا۔

اُدھر ہندسے سارا دن آپس میں کھیلتے رہے۔ جب شام کو واپس آئے تو صفر گھر میں نہیں تھا۔ ایک نے اسے اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ اس نے پریشان ہو کر سب کو بتایا کہ صفر کھو گیا ہے مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ یوں بھی ایک کی قیمت ان سب میں کم تھی اس لئے وہ اسے بھی ذرا کم اہمیت دیتے تھے۔

"صفر جائے گا کہاں۔ یہیں ہوگا۔ خود ہی آجائے گا۔" آٹھ نے منہ بنا کر کہا۔ نو نے اس کی تائید کی۔ اور اب کسی ہندسے کی مجال نہ تھی کہ نو کے آگے کچھ کہے۔ سب ہندسے سو گئے۔

دوسرے دن ریاضی دان نے شہر سے واپس آکر سب ہندسوں کو اکٹھا کیا۔ اس کا ارادہ تھا آج سو تک گنتی مکمل کر لے مگر یہ کیا؟ صفر ان میں نہیں تھا۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ صفر واپس نہ آئے۔ اس نے پریشان ہو کر سب سے پوچھا مگر کسی کو بھی صفر کے متعلق علم نہ تھا۔ آج اسے صفر کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اور آج ہی صفر غائب تھا۔

"تم پہلے ہی صفر سے لڑتے رہتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کسی نے اس سے لڑائی تو نہیں کی۔" ریاضی دان نے ڈانٹ کر پوچھا۔ سب ہندسوں کی سٹی گم ہو گئی۔

"ایک" نے آخر ڈرتے ہوئے سارا ماجرا بیان کیا کہ کس طرح کل صفر سے جھگڑا ہوا اور وہ ناراض ہو کر چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اب تو ریاضی دان کو خوب غصہ آیا۔ اس نے سب کو خوب ڈانٹا۔

"تم سب نالائق ہو۔ تمہیں صفر کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ نو کے بعد دس بنانے کے لئے ایک اور صفر کو ملاتے ہیں۔ اس طرح بیس، تیس، پھر چالیس اور پچاس بنانے میں بھی صفر کی ضرورت ہوتی ہے اگر صفر نہ ہو تو گنتی نو تک ہی رہ جائے گی۔ جاؤ جلدی سے صفر کو ڈھونڈو۔" ریاضی دان بہت غصے میں تھا۔

سارے ہندسے ڈر گئے۔ اب انہیں صفر کی قدر و قیمت معلوم ہوئی کہ وہ نہ ہو تو ان کی بھی کچھ اہمیت نہیں۔ سب کے سب اسے ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ شام ہو گئی مگر صفر نہ ملا۔ ریاضی دان بہت پریشان تھا۔ اگر صفر نہ ملا تو کیا ہو گا؟ وہ گنتی مکمل نہ کر سکے گا۔ یہی سوچ اسے پریشان کر رہی تھی۔ آخر تین کو صفر جھاڑی میں چھپا ہوا مل گیا۔ اس نے اسے واپس گھر چلنے کو کہا مگر صفر نہ مانا۔ قریب سے "ایک" گزرا وہ بھی صفر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر صفر بہت ناراض تھا۔ وہ کسی کی بات نہیں سن رہا تھا۔

"تم ایک ...... تم میرے دوست تھے مگر...... مگر تم نے بھی میری کوئی مدد نہ کی۔ جاؤ تم سب میرے دشمن ہو۔ میں کسی کی بات نہیں مانوں گا...... میں واپس نہیں جاؤں گا۔" دکھ اور غصے کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

"میں ان سب کے مقابلے میں اکیلا تھا۔ میں کیسے تمہاری مدد کرتا۔ میں نے ریاضی دان کو ساری بات سچ سچ بتادی ہے۔ وہ غصے میں ہے۔ اس نے سب کو خوب ڈانٹا ہے۔ تم چلو ورنہ وہ ہم سب کو ختم کر دے گا۔" ایک نے صفر سے کہا۔ مگر صفر پھر بھی نہ مانا۔ آخر چار دوڑ کر گیا اور ریاضی دان کو بلا کر لایا۔

ریاضی دان نے صفر کو بڑے پیار سے سمجھایا۔ اسے اس کی اہمیت بتائی سب ہندسوں نے صفر سے معافی مانگی اور شرمندگی ظاہر کی۔ پھر ریاضی دان نے ان سب کی دوستی کرا دی اور یوں صفر واپس آگیا۔ دوسرے دن چمکیلی دھوپ میں ریاضی دان نے ڈھیر سارے ہندسے اور سوال صفر کی مدد سے تیار کئے۔ صفر کو اور دوسرے ہندسوں کو بھی صفر کی اہمیت کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا۔ صفر کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

چھٹی کے بعد سب ہندسوں نے صفر کے ساتھ مل کر بہت سے کھیل کھیلے اور "اس طرح سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

برجستہ

ایک بار مولانا محمد علی جوہر سے کسی نے پوچھا۔ آپ کے نام کے آگے جوہر لگا ہے یعنی محمد علی جوہر آپ کے بھائی شوکت علی کو ہم کیا کہیں؟ مولانا محمد علی جوہر نے کہا "آپ بے شک انھیں شوکت علی شوہر کہہ لیں۔"

مرسلہ۔ منہاج احمد خان۔ نارتھ کراچی

چیزوں کی کہانی

برتن

آصف فرّخی

چائے کی پیالیاں، تشتریاں، رکابیاں، پتیلیاں، قابیں، پیالے، ڈونگے، بھگونے، کٹورے، مٹکے، صراحیاں، بوتلیں اور گلاس..... ہماری زندگی میں کتنے بہت سے برتن کھنک رہے ہیں۔ یہ خاموشی سے اور کبھی باآواز بلند ہمارے ہر کھانے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو کھانا کس میں پکے، کیسے کھایا جائے اور کہاں رکھا جائے؟ اپنا کام ختم کر کے برتن الماریوں اور دیواروں پر واپس چلے جاتے ہیں تو ان کے دم قدم سے گھر گرہستی آباد لگتی ہے۔

برتن بہت دور سے آئے ہیں۔ انہوں نے انسان کے ساتھ ساتھ بڑا سفر طے کیا ہے۔ تب کہیں جاکر آج کی اس صورت کو پہنچے ہیں۔

پتھر کے دور کے لوگ جب شکار کرتے کرتے کھیتی باڑی کرنے لگے تو اس وقت ان کے پاس سامان رکھنے کے لئے اپنی بنائی ہوئی ایک ہی چیز تھی، اور وہ تھی ٹوکری۔ یہ ٹوکری گھاس یا تنکوں سے بنی ہوئی ہوتی۔ اپنی بنائی ہوئی ٹوکریوں کو مضبوط کرنے کیلئے بعض لوگ ان کے اندرونی حصے میں چکنی مٹی کی تہ جما دیتے تھے۔

ٹوکری بہت دنوں تک سارا بوجھ اٹھاتی رہی۔ مگر ان لوگوں پر ایک دن اچانک ایک حیرت انگیز بات کا انکشاف ہوا۔ اگر ٹوکری کو آگ کے پاس رکھ دیا جاتا تو اس کا جو حصہ مٹی کا بنا ہوا تھا وہ سخت ہو جاتا۔ اور اگر ٹوکری کا گھاس پھونس اور تنکوں والا حصہ الگ کر لیا جاتا، تب بھی یہ سختائی ہوئی مٹی اپنی شکل برقرار رکھتی۔ مٹی کے اس خول میں یہ خاصیت تھی کہ اگر اسے دوبارہ آگ پر رکھ دیا جاتا تب بھی یہ نہیں ٹوٹتا تھا اور اس میں پانی بھر دیا جاتا تو پانی نہ رستا نہ ٹپکتا۔ پانی کو ذخیرہ کرنے اور آگ سے نہ جلنے والی یہ چیز پہلا برتن بنی۔

مٹی کے اس برتن نے جلد ہی انسان کی زندگی

میں اپنی جگہ بنالی اور اپنی افادیت کا احساس دلایا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ برتن ضروریات زندگی بن گئے۔

مٹی کی فراہمی بھی آسان تھی اور اسے مختلف شکلوں میں ڈھالنا بھی۔ مٹی کے برتن ایک اہم سہولت بن گئے اور مٹی کے برتن بنانے کا ہنر بڑے کام کا ثابت ہوا۔

برتن بنانے کا ہنر ایک باقاعدہ فن بن گیا۔ صدیوں کے سفر میں طرح طرح کے برتن استعمال ہونے لگے۔ ان کی شکلیں بھی مختلف تھیں اور کام بھی الگ الگ۔

برتنوں نے اپنی زندگی کا آغاز باورچی خانے سے کیا تھا، مگر وہاں سے باہر نکل کر نازک اور دلکش پیالے اور گلدان بن گئے۔ نقاشی اور پچی کاری والے ظروف قدیم بابل، مصر اور یونان کے امرا اور روسا کے گھروں کی زینت تھے۔ میکسیکو کے قدیم باشندے جو آزٹیک کہلاتے تھے، عجیب و غریب شکلوں کے برتن بناتے تھے۔ ان کے برتن جانوروں یا لوگوں کی شکلوں پر بنائے جاتے تھے۔ انہوں نے ایسے برتن بھی بنائے جو کھانا پکنے کے دوران سیٹی یا جھنجھناہٹ کے ذریعے موسیقی کا سا تاثر دیتے تھے۔

اس تمام عرصے میں لوگ کھانے کے ذائقے اور غذائیت کو بہتر بنانے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔ جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ کھانے کو ڈھانپ دیا جائے تو زیادہ دیر تک گرم رہتا ہے اور اس کا ذائقہ بھی دیر تک برقرار رہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے ڈھکنے والے برتن بننے لگے۔ اب برتنوں کے لئے مختلف دھاتیں استعمال ہونے لگیں، تانبا، پیتل اور بعض مرتبہ لوہا۔ دھات کے بنے ہوئے برتنوں کا فائدہ یہ تھا کہ یہ مضبوط اور دیرپا ہوتے تھے۔ یہ برتن محض سہولت ہی نہیں، بلکہ گھر کا اثاثہ اور دولت بھی سمجھے جاتے تھے۔

کھانا پکانے کو ہزاروں برس پہلے ہی اعلیٰ درجے کا فن سمجھا جانے لگا تھا۔ قدیم یونان کے دولت مند لوگ بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کرتے جن میں ماہر فن باورچیوں کی خدمات بھاری اخراجات کے بعد حاصل کی جاتیں اور اعلیٰ درجے کے برتنوں میں کھانا چنا جاتا۔ قدیم روم کے باشندے عمدہ کھانوں کے بہت دلدادہ تھے اور باورچی خانے میں کام کرنے والے ہنرمند اور ماہر غلاموں کو بھاری رقم خرچ کرکے حاصل کرتے۔ قلتی قوم کی ایک ملکہ کو کھانے کا ایسا شوق تھا کہ اس نے وصیت کی کہ اسے اس کے پسندیدہ برتن کے ساتھ دفن کیا جائے۔ خدا معلوم اسے قبر میں کس ضیافت کی توقع تھی؟

پکانے ریندھنے کے معاملے میں فرانسیسی لوگ بڑے ماہر ہیں۔ کھانے اور پکانے کے معاملے میں ان کی مہارت اور نفاست کچھ آج کی بات نہیں بلکہ اس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ سات سالہ جنگ میں ایک مشہور فرانسیسی جرنیل کو اپنی فوج کی شکست کی خبر نے آزردہ کر دیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ دشمن اس کے باورچی کو گرفتار نہیں کر پایا تو

جرنیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ ایک فرانسیسی بادشاہ نے تمیں باورچی ملازم رکھے ہوئے تھے جو ۸۰ مختلف برتنوں میں شاہی دسترخوان کے لئے مسالے اور چٹنیاں، مربے تیار کرنے پر مامور تھے۔

بادشاہوں کے اس بے جا اصراف کے مقابلے میں، عام آدمی بہت سادگی سے رہتے تھے۔ امریکا کے ابتدائی آباد کار، معمولی چیزوں پر گزارہ کرنے کے عادی تھے۔ لکڑی کے پیالے، تشتریاں عام تھیں اور اکثر لوگ اپنے استعمال کی چیزیں خود ہی بنا لیتے۔ جرمنی اور انگلستان میں چینی کے برتن ایک صنعت بن گئے اور دور دور تک ان کی تجارت ہونے لگی۔

ہندوستان اور پاکستان کے کھانوں کی طرح، برتن بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے کھانے پکانا اور کھانا، برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کے دور میں ترقی کر کے ایک فن کا درجہ اختیار کر گیا اور ان کے دسترخوان، خوانِ نعمت معلوم ہونے لگے۔ کیا بادشاہ اور کیا عوام، سبھی چٹخارے کے قائل تھے۔ پرانی کتابوں میں اس وقت کے دسترخوان کا احوال آج پڑھیں تو افسانوی معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سے کھانے اور جن برتنوں میں وہ کھائے جاتے تھے، آج ہمارے لئے اجنبی ہیں۔

میر امن کی مشہور کتاب "باغ و بہار" (جسے قصہ چہار درویش بھی کہا جاتا ہے) ۱۸۰۳ء میں پہلی بار چھپی تھی۔ دوسرے درویش کی سیر میں ایک جگہ گھر کے اسباب کی فہرست گنوائی گئی ہے جس سے اس زمانے کے برتنوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔ اس فہرست میں جو برتن شامل ہیں، وہ یہ ہیں۔

دیگ، دیگچے، پتیلے، طباق، رکابی، بادیئے، طشتری، چمچے، بکاولی، کفگیر، طعام بخش، سرپوش، سینی، خوان پوش، تورہ پوش، آب خورے، بجھرے، صراحی، لگن، پاندان، چوگھرے، چنگیر، گلاب پاش، عود سوز، آفتابہ، چلمچی۔

زمانے کے ساتھ ساتھ دسترخوان اٹھ جاتا ہے اور برتن بدل جاتے ہیں۔ مٹی کے برتن پہلے عام تھے۔ صراحی اور مٹکے کی جگہ اب کولر میں پانی رکھا جاتا ہے۔ تانبے اور پیتل کے برتن، قیمتی سمجھے جاتے تھے اور جہیز میں دیئے جاتے تھے۔ بُرا وقت پڑنے پر یہ برتن بیچ کر گھر چلایا جاتا تھا۔ اب ان کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کے برتن آگئے ہیں۔ باورچی خانے میں بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح مشینوں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود پرانے انداز کے برتنوں کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آئی۔ سندھ کا تاریخی شہر "ہالہ" روایتی ظروف سازی کا مرکز ہے۔ اس کے نیلے اور سفید نقش و نگار مخصوص ہیں اور دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ رنگ اور یہ نقش آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک اور سکون کا احساس دیتے ہیں جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔

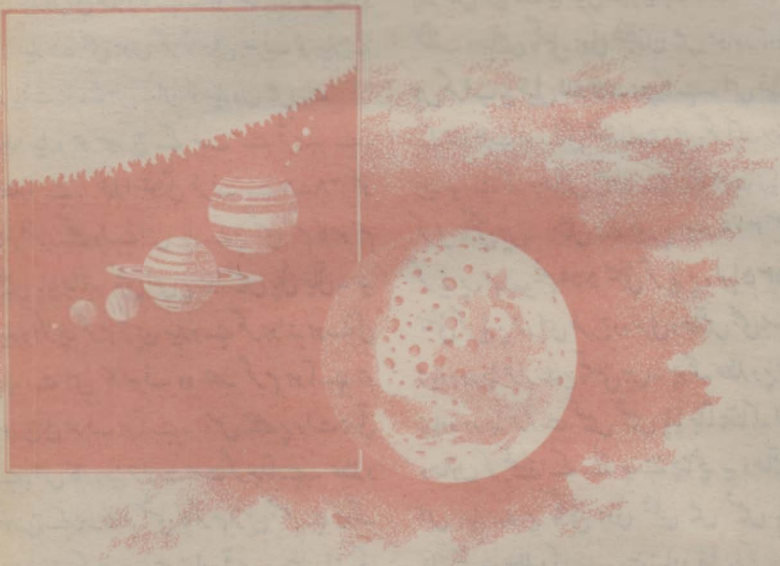

سورج کا قریب ترین پڑوسی

سیارہ عطارد

سید ذیشان احمد زکریا

دوستو! اللہ کی بنائی ہوئی یہ کائنات کتنی وسیع ہے۔ اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صرف اللہ ہی کو ہے۔ اس عظیم الشان کائنات میں کھربوں کھرب کہکشائیں ہیں جن میں کروڑوں اور کھربوں کے حساب سے چھوٹے بڑے ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہماری کہکشاں بھی ان ہی عظیم کہکشاؤں میں سے ایک ہے جس میں کھربوں ستارے پائے جاتے ہیں۔ اس کے ان لاتع ستاروں میں ایک معمولی اور ستاروں کی جسم طور پر تقسیم بلحاظ حجم کے اعتبار سے تیسرے نمبر آنے والے ستاروں میں سے ایک ستارہ سور ہے۔ اس ستارے کے گرد گھومنے والے چھوٹے اور کچھ بہت بڑے سیاروں اور سیارچو کے نظام کو نظامِ شمسی یعنی سورج کا نظام کہتے ہیں

ن سیاروں کی تعداد نو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو ور سیارے بھی ہوں مگر تا حال صرف نو سیارے دریافت ہوئے ہیں۔ ان نو سیاروں میں سے پہلا سیارہ جو سورج کے سب سے قریب ہے، عطارد ہے۔ خط استوا کی طرف سے ۴۸۷۸ کلو میٹر قطر رکھنے والے اس سیارے پر کسی قسم کا موسم نہیں پایا جاتا۔ یعنی اس پر ہوا نہیں پائی جاتی۔ یہ سیارہ اگرچہ گرم ترین سیارہ ہے مگر ہوا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا صرف وہ حصہ گرم ہوتا ہے جو سورج کی طرف ہوتا ہے۔ جس حصے پر رات ہوتی ہے، اس کا درجۂ حرارت بہت گر جاتا ہے۔ عطارد سورج کے بعد نظام شمسی کا گرم ترین جسم ہے کیونکہ یہ سورج کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی گرمی مختلف جگہوں اور موقعوں کی مناسبت سے بدل سکتی ہے۔ اگر ہم سینٹی گریڈ کے لحاظ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دوپہر کے وقت اس کا درجۂ حرارت عام طور پر ۴۲۷ سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ لیکن رات کو اس سخت گرمی کے بر خلاف سخت سردی ہوتی ہے اور درجہ حرارت ۱۷۳- سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ صرف سطح کے درجہ حرارت ہیں۔ زیر سطح اتنی گرمی نہیں ہوتی بلکہ درجہ حرارت ۱۴ سینٹی گریڈ سے لے کر ۱.۷۲ سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ سطح پر مٹی کی قسمیں بھی درجہ حرارت کے کم یا زیادہ ہونے پر اثر انداز ہوتی ہیں مثلاً بعض جگہوں پر درجہ حرارت مٹی کی قسم کی مناسبت سے ۳۲۷ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔

چند سال قبل تک یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ عطارد پر مختلف دھاتیں پگھلی ہوئی شکلوں میں موجود ہوتی ہیں مگر اب یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس خیال کے غلط ثابت ہونے کی مختلف وجوہ ہیں مگر ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دھاتیں پگھلنے کے لئے بہت زیادہ گرمی مانگتی ہیں۔ مثال کے طور پر سیسہ ۳۲۹ سینٹی گریڈ پر، ایلمونیم ۵۵۹ سینٹی گریڈ پر، لوہا ۱۵۳۵ سینٹی گریڈ پر اور اسی طرح دوسری دھاتیں بھی بہت زیادہ درجۂ حرارت پر پگھلتی ہیں۔ چونکہ عطارد پر اتنا زیادہ درجۂ حرارت کہیں نہیں پایا جاتا جتنا کہ ان دھاتوں کو پگھلنے کے لئے چاہئے چنانچہ یہ دھاتیں اس سیارے پر پگھلی ہوئی شکل میں نہیں پائی جا سکتیں۔ عطارد کی سب سے زیادہ قابل ذکر بات اس کی زمین کی چاند سے مشابہت ہے۔ عطارد کے نقشے چاند کے نقشوں سے ملتے جلتے ہیں۔ عطارد پر بھی چاند کے گڑھوں کے مشابہ یعنی انہی کی شکل و صورت سے ملتے جلتے گڑھے پائے جاتے ہیں۔ عطارد پر بعض ایسے گڑھے بھی پائے جاتے ہیں جن کے ایک سے زیادہ دائرے (RINGS) ہوتے ہیں۔ عطارد پر پائے جانے والے ان گڑھوں کو (BASIN) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے سب سے بڑا (BASIN) جس کا نام (CALORIS BA-SIN) ہے جو چاند پر موجود (ORIENTAL RING) سے بہت ملتا جلتا ہے، (CALORIS BASIN) کا قطر ۱۲۰۰ کلو میٹر ہے اور عطارد میں سب سے زیادہ گرمی اسی (BA-

(SIN) پر پڑتی ہے۔

چاند کی طرح عطارد پر بھی سخت پتھروں کی ایک موٹی تہہ ہے۔ عطارد کے پہاڑ بھی چاند کے پہاڑوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس کے پہاڑ گول گھومتی ہوئی شکل کے ہوتے ہیں جن کی سطح خلائی مٹی سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لاوے کے بڑے بڑے میدان اور قدیم زمانے کے گڑھوں، پتھروں کے ٹکرانے کے عمل کے باعث پیدا ہونے والی دراڑیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان دراڑوں کی شکل سے جو عطارد پر پائی جاتی ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عطارد سردی کے باعث سکڑ گیا ہے۔ اس کے علاوہ عطارد پر موجود پرانے گڑھے لاوے کے بہنے اور پگھلنے سے پُر ہو چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عطارد پر لاوے کے پگھلنے اور سیارے پر موجود مختلف اجسام کے آپس میں ٹکرانے کا عمل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح آج سے ساڑھے تین ساڑھے چار ارب سال قبل چاند پر ہوتا تھا۔

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ عطارد کے متعلق سب سے زیادہ قابل اور مفید معلومات ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے عرصے میں حاصل ہوئیں تھیں جب امریکہ اور روس کے عطارد اور زہرہ کی طرف بھیجے گئے مشن سے معلومات آنا شروع ہوئی تھیں۔ ان خلائی گاڑیوں میں جو ان سیاروں کی طرف بھیجی گئیں تھیں، عطارد کے سلسلے میں (MARINER 10) سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس نے عطارد کے گرد تین چکر لگائے تھے اور عطارد کی سطح سے صرف ۳۲۷ کلو میٹر کے فاصلے سے تصاویر ارسال کی تھیں۔

عطارد کی سطح پر بسالٹ کی مٹی اور پتھر پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی سطح نہایت ہلکا سا گلابی رنگ بھی ظاہر کرتی ہے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء کو چھ انچ ایرچر کی ایک (QUESTER TELE-SCOPE) سے لی گئی تصاویر میں دیکھا گیا کہ عطارد کی روشن اطراف میں جھٹپٹے کی طرح کے ہلکے سے نشان موجود ہیں۔ ان نشانات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہ لاوے کے بڑے بڑے وسیع میدان ہوں گے جیسے کہ چاند پر پائے جاتے ہیں جو کہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

عطارد کا کوئی چاند نہیں۔ ۱۸۶۰ء کے آس پاس ایک فرانسی ماہر فلکیات (U.J LEVERR-IER) نے کچھ وجوہات کی بنا پر کہا تھا کہ عطارد کے مدار میں ایک اور سیارہ موجود ہے مگر بعد میں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ اس موقع پر یہ بتادوں کہ (U.J FEVERRIER) ایک بہت اچھے ماہر فلکیات تھے اور انھوں نے ہی ۱۲ ستمبر ۱۸۴۶ کو نظام شمسی کے آٹھویں سیارے نیپچون کی دریافت کی تھی۔

اب آخر میں میں آپ کو عطارد کی گردش کے متعلق کچھ بتاتا چلوں۔ عطارد سورج کے گرد اپنا ایک چکر ۸۸ دنوں میں مکمل کرتا ہے اور اپنے محور پر گھومنے میں ۵۸.۶ دن لگاتا ہے۔ زمین اپنے محور پر گھومنے میں ایک دن اور سورج کے گرد گھومنے

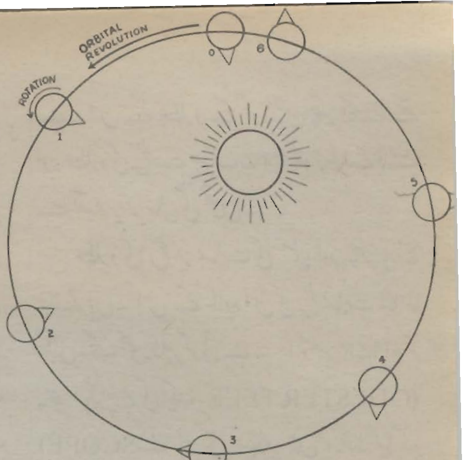

میں ۳۶۵ دن لگاتی ہے۔ عطارد کے ان دونوں عرصوں کا ملاپ ظاہر کرتا ہے کہ عطارد کے آسمان پر سورج بہت آہستہ حرکت کرتا ہے اور ایک صبح سے دوسری صبح، ایک دوپہر سے دوسری دوپہر، ایک رات سے دوسری رات وغیرہ تک آنے میں ۱۹۶ دن لگاتا ہے۔ (زمین صرف ۲۴ گھنٹے لگاتی ہے)۔ اگر ایک وقت میں عطارد کے شمال پر دوپہر ہے تو جب عطارد سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرے گا تو شمال پر دوپہر کے بجائے رات ہوگی اور آئندہ ایک اور چکر لگانے کے بعد شمال پر دوبارہ دوپہر کا وقت ہوگا۔ یہ بات تفصیل سے آپ خاکے کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں جو اس مضمون کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ اس تصویر میں عطارد پوائنٹ زیرو پر ہے جہاں پر دوپہر کے وقت کا سورج ایک پہاڑ کے عین اوپر ہے۔ جب تک عطارد سورج کے گرد چکر لگاتے لگاتے پوائنٹ ۳ پر پہنچتا ہے، یہ سورج کے گرد آدھا چکر طے کر چکا ہے اور سورج اب پہاڑ پر غروب ہو رہا ہے۔ پوائنٹ ۴ پر عطارد سورج کے گرد ۲/۳ چکر مکمل کر چکا ہے جبکہ اپنے محور پر پورا گھوم چکا ہے۔ اب سیارہ اسی پوزیشن میں ہے جس میں پوائنٹ پر تھا مگر اب پہاڑ پر رات ہے۔ یوں یہ گھومتے ہوئے جب پوائنٹ ۶ پر پہنچتا ہے تو اس پر بجائے دوپہر کے آدھی رات کا وقت ہے۔ اب عطارد کو پہلی پوزیشن پر دوبارہ آنے کے لئے سورج کے گرد مزید ایک چکر لگانا ہوگا۔

جس طرح ہر سیارے اور چاند کی گردش میں کچھ عرصے بعد کچھ نہ کچھ فرق آ جاتا ہے، اسی طرح عطارد کی سورج کے گردش میں بھی کچھ عرصے بعد فرق آ جاتا ہے۔ یہ فرق ۴۳ سیکنڈ فی صدی کا ہے۔ اگرچہ یہ فرق بظاہر معمولی سا ہے مگر اس فرق نے ماہر فلکیات کو سوچ میں ڈالا ہوا تھا کہ بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جس کے باعث یہ فرق آئے تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی فرق کے باعث (U.J.L-EVERRIER) نے عطارد کے مدار میں ایک چاند کے موجود ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ نیوٹن اور کیپلر کے قوانین بھی اس معاملے پر صحیح طرح روشنی نہیں ڈال سکے تھے۔ بالآخر سر البرٹ آئن سٹائن نے نظریۂ اضافت کی مدد سے اس فرق کے اسباب ظاہر کئے تھے۔ نظریۂ اضافت کی رو سے یہ فرق ۴۳۰۳ سیکنڈ نکلا تھا۔ اس انتہائی صحیح فرق کے بتانے پر نظریۂ اضافت کی خوبی اور اہمیت ظاہر ہوئی تھی جس نے اس نظریئے کی قبولیت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

کرشمہ

قسط نمبر۔ ۹

اظہر نیاز

جواد، ذیشان کا دوست تھا۔ وہ حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ جواد کو ٹی. وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ آغا عمران نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر انصاری صاحب، سے سفارش کر کے جواد کو ڈراموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انصاری صاحب بھی جواد کی پراسرار قوت سے بہت متاثر ہوئے ریہرسل کے دوران جواد کی ملاقات مس نائلہ سے ہوئی جو شہر کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھی۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کا خیال تھا کہ نائلہ کا باپ، سخی بٹ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے مگر ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ انسپکٹر شعیب مسلسل سخی بٹ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چند پراسرار سے لوگ مسلسل جواد کے تعاقب میں تھے۔ وہ سرِراہ اسے روک کر راستہ پوچھتے اور اس کے خلاف عمل کر کے جواد کی پیشن گوئیوں کا امتحان کرتے جو اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ پولیس ان افراد کی نگرانی کر رہی تھی جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ سخی بٹ کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا اپنی سائیکلوں پر شام کی سیر کے لئے نکلے تو چند مشکوک افراد نے انہیں اغوا کر کے ایک محل نما عمارت میں پہنچا

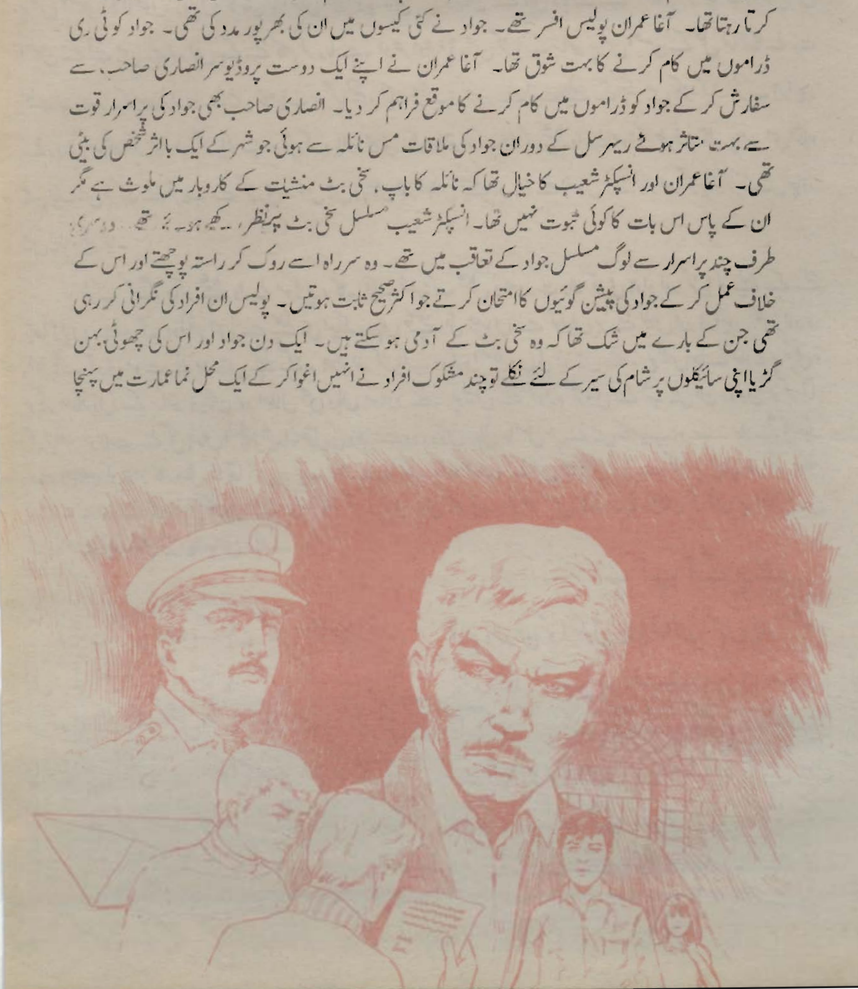

ڈیز۔ محل کے مالک کا نام پرنس احسن تھا۔

ذیشان اور اجلال، جواد کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ شید اپستول سے بھی ملے اور وہیں سے انہیں ایک پرچی ملی جس پر کوڈورڈز میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجلال نے بڑی محنت سے اسے ڈی کوڈ کیا۔ مگر اس نمبر پر ایک پٹھان چوکیدار کے علاوہ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں آغا عمران گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ جس مجرم کو انسپکٹر شعیب نے بڑی محنت سے گرفتار کیا تھا کسی نے حوالات کے اندر اسے قتل کر دیا ہے۔

پرنس احسن نے بالآخر جواد کو بڑی مشکل سے اپنے لئے کام کرنے پر راضی کر لیا۔ جواد نے اپنی چھٹی حس کی بدولت پرنس احسن کا لاکھوں روپوں کا مال باآسانی نکلوا دیا لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے معلوم کر لیا کہ جواد پرنس احسن کے قبضے میں ہے اور اس کے لئے کام کر رہا ہے۔ ادھر جواد اپنی بہن گڑیا کے ساتھ پرنس احسن کے محل نما ٹھکانے سے سخت جدوجہد کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لینے کے چکر میں پکڑا گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے رومال سونگھا کر جواد اور گڑیا کو بے ہوش کر دیا اور تیزی کے ساتھ ٹرک چلا کر شیشے والے موڑ کی طرف چل پڑا۔ اسی اثناء میں ایک بس ٹرک کے قریب سے گزری۔ اس میں ذیشان اور اجلال بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جواد اور گڑیا کو ٹرک میں چادر میں لپٹا دیکھ لیا۔

ٹرک آگے جاکر شیشے والے موڑ پر رکا۔ ایک خطرناک شکل و صورت والا آدمی جواد اور گڑیا کو لینے کے لئے جھاڑیوں سے برآمد ہوا مگر اس سے پہلے ہی اچانک وہاں پہنچنے والی جیپوں سے گولیاں برسنے لگیں اور ڈرائیور، کلینر اور وہ خطرناک آدمی موت کے منہ میں چلے گئے۔ جواد اور گڑیا اب دوبارہ اسمگلروں کی قید میں تھے۔ پولیس جائے حادثہ پر پہنچی تو دیگر مسافروں کے ساتھ ذیشان اور اجلال بھی وہاں موجود تھے۔ پولیس نے آوارہ گردی کے شبہ میں ان دونوں کو گرفتار کر لیا اور حوالات لے گئی جہاں انسپکٹر شید اپستول کی وجہ سے وہ دونوں رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حادثے کی جگہ سے ذیشان کو جواد کا رومال ملا تھا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ آغا عمران نے اس نقشے کی مدد سے محل پر چھاپہ مارا مگر ناکام رہے۔ جواد نے مجبوراً اسمگلروں کے لئے کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ ادھر مس نائلہ نے ذیشان کو فون پر اطلاع دی کہ وہ اسے ایک اہم خبر دینا چاہتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھئے

ذیشان مس نائلہ کے ہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں اپنے گھر بلا لیا۔ مس نائلہ سے پتا چلا کہ شہر میں ایک انٹرنیشنل اسکول ہے جسے چند غیر ملکی چلاتے ہیں لیکن اس اسکول کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں تبلیغ بہرحال نہیں کی جاتی۔ مس نائلہ نے بتایا کہ کل اس اسکول کے پرنسپل نے تمام والدین کو اسکول بلایا تھا اور انہیں چند مشہور برانڈ ٹافیوں کے پیکٹ دکھائے۔ یہ تمام کے تمام پیکٹ درآمد شدہ تھے۔ پرنسپل نے والدین سے کہا کہ ان ٹافیوں میں نشہ آور دوا ملی ہوئی ہے۔ ہم نے لیبارٹری سے اس کا تجزیہ کرایا ہے۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں

کو غیر ملکی سویٹ اور ٹافیاں نہ دیں۔ اگر غیر ملکی ٹافیاں دینا بہت ضروری ہوں تو ہم سے مشورہ کرکے برانڈ طے کرلیں یا خود انھیں ایسی ٹافیاں دیں جنہیں لیبارٹری سے ٹیسٹ کرالیا جائے۔ پاکستان کی بھی مشہور برانڈ کی ٹافیاں ہیں وہی اپنے بچوں کو دیں۔ یہ جو ہر گلی کوچے میں جو ٹافیاں بنانے کی "فیکٹریاں" لگی ہیں ایک تو یہ صحت کے اصولوں کے مطابق کام نہیں کرتیں دوسرے ان میں بھی نشہ آور دواؤں کی ملاوٹ کا خدشہ ہوسکتا ہے۔ پرنسپل نے جن برانڈ کی نشان دہی کی ہے ان کے نام اور نمونے...... یہ میں آپ کے ابو کے لئے لے آئی ہوں۔

مس نائیلہ نے ایک پیکٹ ذیشان کے حوالے کیا جس میں کئی برانڈ کی ٹافیاں تھیں۔ "بہت شکریہ" ذیشان نے کہا۔ "یہ تو ہوگئیں سرکاری باتیں، اور سنائیں کیا حال ہے۔ آج کل آپ کس ڈرامے میں کام کر رہی ہیں؟"

"نہیں وہ...... چلڈرن کلب میں ہی کیا تھا۔ جواد کے اغوا کے بعد وہ پروگرام بھی تھوڑا سا بدل کر ٹیلی وژن نے فوراً بند کردیا۔ کچھ اخبارات نے جواد کی خبر ٹیلی وژن کے حوالے سے لگادی تھی کہ چلڈرن کلب کا چیئرمین اغوا ہوگیا۔ پھر بچوں نے بھی خط لکھے کہ چلڈرن کلب کے ممبران کے ذمہ یہ کام لگایا جائے کہ وہ جواد کو تلاش کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن اپنے پروگرام میں اس طرح کی تبدیلی نہیں کرسکتا تھا اس لئے پروگرام ہی بند کردیا۔"

ذیشان نے وہ پیکٹ اور ساری معلومات جو مس نائیلہ نے اسے پہنچائی تھیں اپنے ابو کو بتائیں تو و سوچ میں پڑ گئے۔

"ابو کیا سوچ رہے ہیں؟"

"وہ جو آدمی حوالات میں مر گیا تھا وہ غیر ملکی ٹافیوں کا ڈیلر تھا۔ پتہ کرتا ہوں کہ غیر ملکی ٹافیاں کون کون امپورٹ ایجنسیاں در آمد کرتی ہیں۔"

"ابو...... آپ بھی کتنے معصوم ہیں۔ ٹافیاں در آمد ہو کر نہیں آتی ہوں گی بلکہ فیصد اسمگل ہو کر آتی ہوں گی۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" آغا عمران نے کہا۔ "اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ اسمگل شد مال کو ڈیلر کے ذریعے ہی پہنچایا جاتا ہوگا۔ گزشتہ دنوں بھی ہم نے ایک ڈیلر کو پکڑا تھا جو مشہور برا کی اشیاء کا ڈیلر تھا اور خود دو نمبر مال بناتا تھا۔ چونکہ خود ڈیلر بھی تھا اس لئے دوکان دار اس پر اعتما کرتے ہوئے اس کے کارندوں سے مال خرید تھے اور وہ بڑے مزے سے اپنا دو نمبر مال اصل کرکے بیچ دیتا۔"

آغا عمران نے فوراً انسپکٹر شعیب سے رابطہ قائم کیا اور اسے ہدایات دیں کہ غیر ملکی ٹافیاں در آمد کرنے والے اور ان کے ڈیلرو کے پتے معلوم کئے جائیں، اور یہ کام جتنی جلد ہو جائے بہتر ہے۔

"تو آپ ذیشان کے بہکاوے میں
گئے۔" انسپکٹر شعیب نے کہا۔
کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"مجھے معلوم ہے۔" انسپکٹر شعیب نے
"مس نائیلہ جو کہ سخی بٹ کی اکلوتی بیٹی
......
ں۔ آج ہی ذیشان سے ملی ہیں اور میں انتظار
ں تھا کہ آپ کی طرف سے کیا حکم ملتا ہے۔ یہ
ری تحقیقات کو غلط راہ پر ڈالنے کا ایک حربہ
ہے۔ آپ دیکھیں گے مجرم سخی بٹ ہی نکلے
۔"

جواد نے ایک خط ذیشان کے نام لکھنا شروع کیا
یوں کہ وہ ایک آدمی کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا
ں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خط لیٹر بکس میں ڈال دے
۔ جواد کا خیال تھا کہ بیرنگ خط کے ذیشان تک
نچنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ اس نے لکھنا شروع
۔

میرے دوست ذیشان
لام علیکم!
میں چند اسمگلروں کے قبضے میں ہوں۔ یہ کون
ہیں مجھے کچھ پتہ نہیں۔ اس سے پہلے میں کسی
ل میں قید تھا جہاں ایک محل تھا۔ وہاں سے رہائی
ں اور دوسری قید میں پھنس گیا۔ کہانی لمبی ہے۔
انے چاہا تو ملنے پر سناؤں گا۔ مجھے تو خاص پریشانی
یں البتہ گڑیا اداس رہتی ہے۔ میرے گھر والوں
میری خیریت بتادینا۔ مجھے معلوم ہے میری امی
ری وجہ سے سخت پریشان ہوں گی اور ہر نماز کے
بعد میرے لئے دعائیں مانگتی ہوں گی۔ اس وقت میں جہاں ہوں اس کا حدود اربعہ مشکل نہیں۔ تم لوگ تلاش کر لوگے۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس کوٹھی کا چوکیدار عبدالغفار ہے اور ایک فون نمبر کا مجھے پتہ ہے اور وہ ہے ۲۵۳۰۰۷۔ امید ہے تم جلد ہی اس فون نمبر کی وجہ سے کوٹھی تلاش کر لوگے۔

تمہارا دوست
جواد

طے شدہ اسکیم کے مطابق جواد نے خط کو ہی لفافے کی شکل دی اور جواد کا پتہ لکھ کر اس آدمی کو دے دیا۔ جواد اندر ہی اندر ڈر بھی رہا تھا کہ یہ آدمی کہیں اس کے ساتھ جھوٹ نہ بول رہا ہو اور اس کا خط باس تک نہ پہنچا دے۔ مگر دوسرے دن اس شخص نے دور سے اشارہ کر کے بتایا کہ خط اس نے پوسٹ کر دیا ہے۔

جواد نے اپنے خط میں جس فون نمبر اور کوٹھی کی نشان دہی کی تھی، اجلال اور ذیشان پہلے ہی سے اس کے گرد منڈلا رہے تھے مگر کام کی بات وہ معلوم کرنے سے قاصر تھے۔ ذیشان نے فوراً وہ خط اور اس کوٹھی کے بارے میں جو معلومات اس کے پاس تھیں اپنے ابو کو بتادیں۔ پولیس پارٹی کو تیار کرنے میں صرف پندرہ منٹ لگے تھے لیکن انسپکٹر شعیب کوئی بھی خوش خبری نہ سنا سکے۔ جب وہ لوگ اس کوٹھی پر پہنچے تو وہ کوٹھی خالی تھی۔ باہر تالا لگا ہوا تھا۔ تالا توڑ کر کوٹھی کی تلاشی لی گئی۔

کوٹھی اس طرح خالی تھی جیسے برسوں سے یہاں کوئی نہ رہتا ہو۔

"تو آپ نے معلوم کیا کہ وہ کوٹھی کس کی ہے اور اس کا مالک کون ہے؟"

"جی...... انسپکٹر شعیب نے فوراً خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "وہ کوٹھی سخی بٹ صاحب کی ہے۔"

ابھی انسپکٹر شعیب آغا عمران کو اپنے چھاپے کی کاروائی بتا ہی رہا تھا کہ ڈی ایس پی علی اکبر کا فون آ گیا۔

"سر! اس ڈاکئے کو کسی نے قتل کر دیا ہے جس نے جواد کا خط آپ تک پہنچایا تھا۔"

"کیا مطلب؟" آغا عمران حیرانگی سے چیخ اٹھے۔ "یہ تو اس ڈاکئے کی ذمہ داری تھی اور پھر وہ پہلے بھی ہمارے گھر کی ڈاک لاتا رہتا تھا۔"

"سر! تفتیش سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ڈاکیا ان لوگوں نے خرید رکھا تھا اور آپ کے گھر کی تمام ڈاک وہ پہلے خود کھولتا تھا۔ فوٹو اسٹیٹ کراتا تھا پھر آپ تک پہنچاتا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں اس نے جواد کا خط آپ تک پہنچا دیا، مگر اس کی فوٹو اسٹیٹ، ان لوگوں تک نہیں پہنچائی۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس نے فوٹو اسٹیٹ ان تک نہیں پہنچائی۔"

"سر! ڈاکئے کی جیب سے خط کی فوٹو اسٹیٹ ملی ہے۔"

کچھ نہ کچھ

○ ...... "کیوں بھائی تمہیں تو سخت زکام ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کر رہے ہو نا؟"
"ہاں بھائی، کبھی کبھار ایک آدھ چھینک مار لیتا ہوں۔" (مرسلہ...... حافظ محمد عمر...... میانوالی)

"ہاں لڑکے! انسان کا ضمیر کبھی بھی جاگ سکتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے محبت کی سزا ملی ہے۔ میں اس کے محکمہ کو اس کی تعریف میں خط لکھوں گا اور اس کے بال بچوں کے لئے پولیس فاؤنڈیشن کی طرف سے مراعات کا اعلان بھی کراؤں گا۔"

پرنس احسن سخت غصے میں اپنے بہت بڑے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ چار پانچ مسلح خوفناک شکلوں والے لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔

"جواد کو اس کی غداری کی سزا ملنی چاہئے۔" ایک خوفناک شکل والے نے منہ کھولا۔ پرنس احسن ایک لمحے رکا اس کی طرف دیکھا اور پھر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ دوسرا بولا "جواد کی سزا یہ ہے کہ اس کی بہن گڑیا کو قتل کر دیا جائے تاکہ وہ آئندہ ہم سے غداری کا سوچ نہ سکے۔"

پرنس احسن ایک جھٹک سے مڑا۔

"نہیں...... جواد کی سزا یہ ہے کہ اسے یہ پتا نہ چلے کہ ہمیں اس کی غداری کا پتہ چل چکا ہے۔ بس تم اس کی نگرانی سخت کر دو اور اسے یہ بھی پتا نہ چلے کہ وہ اب بھی پرنس احسن کی قید میں ہے۔ جو بھی

اس سے ملے کیے کہ ہم کوئی دوسری پارٹی ہیں اور ہم پرنس احسن کے دشمن ہیں۔"

اتنے میں ایک اور مسلح آدمی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے نمبر۳؟" پرنس احسن نے نہایت اطمینان سے اس سے پوچھا۔

"جی...... وہ جواد چوں کہ مجھے ہی باس سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ بنگلہ ہمیں فوراً چھوڑ دینا چاہئے کیوں کہ اس پر چھاپہ پڑنے والا ہے۔ یا کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور ہے۔" پرنس احسن نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا۔ "کیا ہمیں اب بھی جواد پر اعتماد کرنا چاہئے۔ نمبر ۳...... پہلے مجھے یہ معلوم کر کے بتاؤ کہ جواد کا لکھا ہوا خط لیٹر بکس تک کیسے پہنچا...... اور جتنی جلدی ہو سکے وہ ہاتھ کاٹ کر میرے سامنے پیش کرو...... جنہوں نے وہ خط لیٹر بکس تک پہنچایا۔"

"جواد کو بلاؤ......" پرنس احسن نے بھیڑیئے کی طرح غرا کر کہا۔

"لیکن آپ؟"

"میں چھپ جاؤں گا۔ تم اسے بلاؤ۔"

ان ہی میں سے ایک شخص کمرے سے باہر نکل گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ جواد کو لے کر پھر حاضر تھا۔ پرنس احسن نے آواز بدل کر پردے کے پیچھے سے بولنا شروع کیا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔"

"جی...... لیکن آپ کون ہیں؟" جواد نے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے جو کچھ پوچھا جائے اسی کا جواب دو۔ اگر یہ درست ہے تو پھر تم نے ہمیں پچھلی مرتبہ جگہ بدلنے کے لئے کیوں نہیں کہا۔"

"جی...... میں بتانے ہی والا تھا کہ آپ نے خود کوٹھی بدلنے کا حکم دے دیا اور پھر مجھے خطرے کا احساس کبھی ہوتا کبھی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے آئندہ بھی مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی میں پیشگی معافی چاہتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ......"

اتنے میں ایک آدمی نے نمبر ۲ کے کان میں کچھ کہا۔

"کیا بات ہے نمبر۲؟" پرنس احسن نے پردے کے پیچھے سے پوچھا۔

"باس...... وہ علی اکبر ہے"

"بلاؤ۔"

ایک آدمی سادہ کپڑوں میں اندر داخل ہوا۔

"ہاں...... اب بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟"

"سر! وہ آپ کی اس جگہ پر بھی چھاپہ پڑنے والا ہے۔"

جواد کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا اور کمپیوٹر نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟

کسی نتیجے پر پہنچ کر جواد نے اپنے پاس موجود چیزوں کے بارے میں سوچا۔ اس کے پاس ایک ڈاک ٹکٹ تھا اور ایک بال پوائنٹ جو اس نے اپنے موزوں میں چھپا رکھے تھے۔ اس نے بوٹوں کا تسمہ باندھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے موزوں سے بال پوائنٹ اور ٹکٹ نکالا۔ ٹکٹ پر بڑا سا "ج" لکھا اور فوراً پنسل بوٹ میں چھپا دی۔ ٹکٹ پر تھوک لگایا اور۔

"سر...... انہوں نے میری بات کی تصدیق کر دی ہے۔ میں ان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جواد اس آدمی کے پاس چلا گیا اور ہاتھ ان صاحب کی کمر پر اس طرح مارا کہ ٹکٹ اس کی قمیض پر چپک گیا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس آدمی کے بازو نے وہ ٹکٹ چھپا بھی دیا تھا۔

نمبر ۲ نے اشارہ کیا اور جواد کو فوراً کمرے سے باہر لے جا کر اس کے اپنے کمرے میں بند کر دیا گیا۔

پرنس احسن پردے کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور آتے ہی سیدھا علی اکبر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ویل ڈن علی اکبر...... ہم آپ کے کام سے خوش ہوئے۔ تم نے ڈاکٹے کو اس کی غداری کی سزا دے کر بہت اچھا کیا۔ تمہیں انعام دیا جائے گا۔ نمبر ۳...... علی اکبر کے بتائے ہوئے اکاؤنٹ میں انعام جمع کرا دیا جائے۔ علی اکبر! یہ ہم کب تک چوہوں کی طرح اپنے بل بدلے رہیں گے۔ ہمیں یہ بات کوئی خاص پسند نہیں ہے۔"

"میں...... یعنی پرنس احسن...... ہا...... " وہ عجیب انداز سے ہنسا۔

"نمبر ۳!...... آغا عمران کے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا بندوبست کرو۔"

"رائٹ سر۔"

"اور ہاں...... وہ تمام انجمنیں جن کا میں سرپرست ہوں۔ ان کی طرف سے تعزیتی بیان بھی تیار کرا دو۔ اور سنو میں ایک ہفتہ کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔ واپسی پر میں ایئرپورٹ سے سیدھا ہوٹل جاؤں گا۔ جہاں آغا عمران کے تعزیتی اجلاس کا انعقاد ہونا چاہئے۔ یاد رکھنا صدارت سخی بٹ کو کرنا چاہئے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی

○ ...... استاد کلاس میں سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ محنت کر کے آدمی جو چاہے بن سکتا ہے آپ لوگ محنت کے ذریعے اپنی خواہشات پوری کر سکتے ہیں۔

ایک شاگرد بولا...... "مگر جناب میرے ابو کہتے ہیں کہ میری خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔" "آخر کیوں؟ تمہاری کیا خواہش ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"جناب میں لیڈی ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔" شاگرد نے معصومیت سے جواب دیا۔

(مرسلہ...... ظفر محمود، کراچی)

خریدار بنائیے

ڈیجیٹل گھڑی

مفت

انعام پائیے

آنکھ مچولی مُلک کا مقبول ترین رسالہ ہے۔

اس کے قارئین کی رائے میں یہ ایک بے حد مفید اور معیاری رسالہ بھی ہے۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس رسالے کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آنکھ مچولی کے جو ساتھی آنکھ مچولی کے دس سالانہ خریدار بنائیں گے، اُنھیں ادارے کی جانب سے ایک ڈیجیٹل گھڑی تحفے میں پیش کی جائے گی —

دس خریدار بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، محلے اور اسکول میں ایسے دس ساتھی آپ ذرا سی کوشش سے تلاش کرسکتے ہیں۔

آگے بڑھیے

سالانہ خریدار بنایئے اور قیمتی انعام پایئے

نوٹ: اس اسکیم میں حصّہ لینے کے خواہش مند ساتھی مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھ کر اسکیم کی تفصیلات اور کوپن منگوا سکتے ہیں

ماہنامہ آنکھ مچولی ۵۔ اے پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵ فون ۴۱۱۵۸۷

نئی نسل کو کس نے تباہ کیا؟

ہما میر

نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان ایک دلچسپ بحث

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے تب سے نئی نسل کی بُرائیاں سنتے آرہے ہیں۔ ایسا احساس ہوتا ہے کہ نئی نسل سے بڑا اور کوئی نہیں ہے اور اگر کوئی اچھا ہے تو صرف ہمارے بزرگ اچھے ہیں۔ نئی نسل کے ہر کام پر تنقید کرنا تو جیسے بزرگوں کا دل پسند مشغلہ ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ کیوں نا اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ نئی نسل بدنام کس طرح ہوئی؟ اس میں ہمارے بزرگوں جیسی صفات کیوں نہیں ہیں؟ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمہ دار کون ہے؟

اس مقصد کے لئے ہم نے ایک محفل کا اہتمام کیا جس میں محلے کے تمام بزرگوں اور نئی نسل کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا۔ اب ان کے درمیان کیا سوال و جواب ہوئے وہ آپ ملاحظہ فرمایئے۔ واضح رہے کہ اس گفتگو کی ذمہ داری بزرگوں اور نئی نسل ہی پر ہے۔ کوئی بات بُری لگے تو ہمیں قصوروار نہ ٹھہرایئے گا۔

بزرگ ....." ہمیں نئی نسل سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ آج کی نسل بے لگام ہوگئی ہے۔ مجال ہے جو بزرگوں سے ادب سے پیش آئے۔ کوئی نصیحت کرو تو فوراً منہ پر جواب دے ماریں گے۔ کم سے کم ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ ٹی وی اور سینما کیا دیکھ لیا ہے اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے لگے ہیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟"

نئی نسل ..... "ہمارے بزرگ ہم پر بے جا پابندیاں لگاتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا ذمہ دار بھی ہمیں ہی ٹھہراتے ہیں۔ ان کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ کہیں اسے ہر حال میں درست مانا جائے۔ چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی انھیں ان کی غلطیوں کا احساس دلائے تو اسے بدتمیز کا خطاب دے دیتے ہیں۔"

بزرگ ....."اے میاں! بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہو۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور ٹیکس کی ادائیگی تو صرف ہم بزرگوں کا فرض ہے۔ تم لوگ کھاؤ، پیو، موج اڑاؤ اور وی سی آر دیکھو اور خون پسینہ ہم بہائیں۔ امتحان میں بیٹھو تو نقل مارو، آپس میں باتیں کرو تو تُو تڑاک سے۔ باپ کی آمدنی سے کوئی غرض نہ رکھو نئی نئی فرمائشوں سے گھر والوں کا جینا دوبھر کر دو۔ یہ تو تم لوگوں کے لچھن ہیں۔ ایک پہیئے پر موٹر سائیکل چلانے لگے ہیں، زنجیر اور کڑا پہننا، رہنا پاکستان میں اور جرسی امریکہ کی پہننا۔ میاں! کیا زندگی گزارنے کے یہی شریفانہ طور طریقے ہیں؟"

نئی نسل ....."جی ہاں۔ یہ خرابیاں ہم میں ہیں۔ لیکن اس کے ذمہ دار بھی تو آپ ہی بزرگ ہیں۔ اگر ہم وی سی آر اور فلم دیکھتے ہیں۔ گلے میں زنجیر اور ہاتھوں میں کڑے پہنتے ہیں تو یہ سب آپ لوگوں کی بے توجہی سے۔ آپ نے کب ہمیں کپڑے پہننے کا سلیقہ سکھایا؟ آپ نے کب ہماری تعلیم اور تربیت پر توجہ دی؟ آپ لوگوں کی ساری دلچسپی پیسے کمانے سے ہے۔ تو جب پیسہ آجاتا ہے تو پھر موج ہم اڑاتے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کے بچے عیش کر رہے ہیں۔ اعتراض کس بات کا؟ اور جہاں تک نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا ذکر ہے تو یہ آپ ہی لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں اپنے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ ہم کس کو سچ مانیں۔ کوئی سنی ہے تو کوئی شیعہ ہے، کوئی دیوبندی ہے تو کوئی اہلِ حدیث ہے۔ آپ لوگ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ کیا دینِ اسلام کی یہی تعلیم ہے؟"

بزرگ ....."صاحبزادے! زبان چلانا تو کوئی تم لوگوں سے سیکھے۔ بزرگوں میں کیڑے نکالتے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم لوگوں کو پیدا کر کے اسی دن کے لئے پالا پوسا گیا تھا کہ جس شاخ پر بیٹھو اسی پہ کلہاڑی چلاؤ۔ چوری چکاری، ڈاکہ زنی، ہتھیار جمع کرنا، کلاشنکوف چلانا، لوٹ مار کرنا۔ ہاں

ہاں ان سب کی تربیت ہم بزرگوں نے ہی دی ہے۔ تم لوگ معصوم ہو۔ تم لوگوں کو ان باتوں کا بھلا کیا علم تھا۔"

نئی نسل ....." ناراض نہ ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سارے الزامات جو آپ نے ہماری نسل پہ لگائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ہماری پوری نسل ڈاکو ہے نہ دہشت گرد ہے۔ کہنے کو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ لوگوں نے ہمیں ورثے میں دولت کی ہوس دی۔ جو ملک دیا تو وہ رشوت اور سفارش کے سہارے چل رہا تھا اور جو حکومت بھی دی تو وہ صرف اپنا خزانہ بھرنے کے لئے آئی اور جو دل دیا تو وہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ آپ کے بزرگوں نے اچھی تربیت اور اچھے ماحول سے آپ کو سونے سے کندن بنادیا مگر آپ لوگوں نے ہمیں کیا دیا؟ کہاں ہے وہ اچھی تربیت اور اچھا ماحول؟ بیروزگاری نے ہماری نسل میں سے بہت سوں کو چور اور ڈاکو بنادیا۔ رشوت اور سفارش نے بے ایمان بنادیا۔ ناقص تربیت نے ہمیں بے کار بنادیا۔ معاف کیجئے گا جب کانٹے بوئے تو پھول کی تمنا کیوں؟"

بزرگ ....."اے میاں! ہم بڑے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ تم بھی برے بنو۔ تم لوگ تو لکھے پڑھے ہو، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے دنیا کو زیادہ دیکھا اور جانا ہے۔ تم لوگ خود اچھے بن کر دکھادو۔ برائی دنیا میں کب نہیں رہی ہے جو لوگ اچھے بننا چاہتے ہیں وہ برائی کا دامن جھٹک دیتے ہیں اور اچھائی کو اختیار کرلیتے ہیں۔ میاں! شیطان کے گھر میں بھی ولی پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن تم لوگوں کا وطیرہ تو یہ ہے کہ اپنے گھر کی گندگی پڑوس کے دروازے پر پھینک دو اور خود معصوم بن جاؤ۔"

نئی نسل ....."آپ لوگ خوش قسمت تھے کہ آپ لوگوں کو اچھے استاد ملے جو تعلیم کے ساتھ کردار بھی سنوارتے تھے۔ اور ایک ہمارے استاد ہیں جو ہمیں پڑھاتے نہیں بلکہ رٹاتے ہیں۔ امتحان میں چیٹنگ کروا کے پاس کراتے ہیں تاکہ نتیجہ خراب نہ آئے۔ اور ہمارے وہ والدین جو سماجی کارکن ہوتے ہیں ان کے پاس دوسروں کے بچوں کے لئے تو بہت وقت ہوتا ہے مگر اپنی اولاد کے لئے نہیں ہوتا۔ والدین کے اس رویئے اور بے توجہی نے ہمیں غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ ہمیں کسی کی راہ نمائی میسر نہیں ہے۔"

بزرگ ....."ہائے! ہائے! اس کی گز بھر لمبی زبان تو دیکھو۔ میاں اتنی عزت کرنا تھی تو پہلے بتا دیتے، ہم خود ہی اپنے سروں پر جوتا مار لیتے۔ اب تم لوگ ہم پر تو سارا الزام مت ڈالو۔"

(یہ کہہ کر تمام بزرگ تو چلے گئے مگر ہمیں مصیبت میں ڈال گئے۔ کیونکہ نئی نسل ہمیں گھور رہی تھی)

یہ سوال اب بھی اپنی جگہ پر باقی ہے کہ نئی نسل کو خراب کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟ کیا آنکھ مچولی اس کا جواب دے سکتا ہے؟

خواب کیا ہیں؟

اکبر علی خان عرشی زادہ

اس نظم میں واو معدولہ کی مشق کرائی گئی ہے واو معدولہ وہ واو ہے جو لکھنے میں آتا ہے مگر بولا نہیں جاتا۔ مثلاً خواب یا خواہش وغیرہ۔

خواجہ صاحب ہمیں پڑھاتے ہیں
ہم کو خوش خوش سکھاتے جاتے ہیں

ہم نے اک دن یہ ان سے خود پوچھا
خواب کیا ہیں؟ ہمیں بتائیں ذرا

بولے اچھے ہوں خواب خواہ بُرے
ولولے ہیں کہ وسوسے دل کے

خوار ہوگے جو سوچو بات بُری
کڑوے خوابوں کٹے گی رات بُری

دن بھلی خواہشوں میں گزرے اگر
میٹھے ہی خواب دیکھو گے شب بھر

قلم قتلے

حکایاتِ رومی

نماز میں بولنے والے

چار آدمی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے۔ ہر شخص نے الگ الگ تکبیر کہی اور نہایت ہی خشوع و خضوع سے نماز کی نیت باندھ لی۔ اتنے میں مؤذن وہاں آیا۔ پہلے نمازی نے اس سے کہا، "ارے بھائی، اذان بھی دے دی تھی یا نہیں؟ اگر نہیں دی تو اب دے لو، کچھ وقت ہے۔"

یہ سنتے ہی دوسرا نمازی بولا، "میاں تم نے نماز میں بات کی ہے اس لئے تمہاری نماز جاتی رہی، اب دوبارہ نیت باندھ لو۔"

تیسرے نے معاً دوسرے کی طرف منہ پھیر کر کہا، "او عقل کے اندھے، اسے کیا الزام دیتا ہے؟ تو خود نماز میں بول پڑا، تیری نماز بھی باطل ہوئی۔"

چوتھے نے کہا، "خدا کا شکر ہے کہ میں نہیں بولا، ورنہ میری نماز بھی جاتی رہتی۔"

دوستو! اس حکایت کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دوسروں کے عیبوں اور برائیوں پر نگاہ رکھنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ نیک بخت وہ ہے، جس نے اپنے عیب پر نظر رکھی اور اگر کسی دوسرے کا عیب بھی بیان کیا تو اسے اپنے آپ سے منسوب کیا۔ کیا خبر آئندہ زمانے میں وہ عیب تجھ میں پیدا ہو جائے۔

فرمان رسول مقبولؐ
(غلام عباس طاہر)

۱۔ بسم اللہ پڑھو اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔

۲۔ زیادہ نہ ہنسو، زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے۔

۳۔ مومن کے اندر تمام عادتیں ہوسکتی ہیں، مگر خیانت اور جھوٹ کی عادت نہیں ہوسکتی۔

۴۔ مظلوم کی بددعا سے بچو، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

۵۔ تم کسی کو بُرے کام سے روکو تو یہ بھی صدقہ ہے۔

۶۔ جس نے راستہ سے ایک تکلیف دہ چیز ہٹا دی، اس کے لئے ایک نیکی لکھی گئی۔

کرکٹ کی تاریخ کا سب سے اولین کنٹرول بورڈ جنوبی افریقہ میں ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ کرکٹ کے کھیل کی ابتدا انگلینڈ سے ہوئی جبکہ آسٹریلیا میں کرکٹ کے کھیل کا باقاعدہ آغاز ۱۸۰۳ء میں ہوا۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں سب سے پہلا وکٹ "ہل"

نے حاصل کیا۔ جبکہ پاکستان کی طرف سے پہلی ٹیسٹ وکٹ "خان محمد نے بھارت کے خلاف" حاصل کی ہے۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں پہلا کیچ چھوڑنے کا اعزاز "چارلس بینز مین" کو حاصل ہے۔ پاکستان نے ٹیسٹ کرکٹ میں ۱۹۵۳ء میں قدم رکھا تھا۔ سب سے پہلا ٹیسٹ میچ کھیلنے والی پاکستانی ٹیم کے کپتان عبدالحفیظ کاردار تھے۔ کرکٹ کی تاریخ میں ایچ جی اور جی ای ویون (نیوزی لینڈ) وہ باپ بیٹا ہیں جنھوں نے اکیس سال سے کم عمر میں ٹیسٹ کیپ حاصل کی۔ کرکٹ انگلینڈ کا قومی کھیل ہے۔

مجھے تم پر فخر ہے

(یاسمین حفیظ، کراچی)

شوبی ابھی تک اسکول سے واپس نہیں آیا تھا۔ بڑی آپا کو بڑی تشویش تھی......

گھر میں سب پریشان ہو رہے تھے۔

"ارے ڈیڑھ بج گیا، بچہ نہیں آیا۔" دادی اماں چھالیا کترتے ہوئے

بولیں۔ ”ارے عاصم جا بیٹا، اسکول جاکر دیکھ دیر کیوں ہوئی؟ مجھے تو بڑے بڑے خیال آرہے ہیں۔“ اماں سر پکڑ کر بولیں...... اماں بی کمزور دل کی مالک تھیں، ذرا دیر ہوئی ...... انہیں پریشانی لاحق ہوجاتی تھی، سو ان کی پریشانی کے ساتھ سارا گھر پریشان ہوجاتا تھا۔

”اماں ابھی آجائے گا، دوستوں کے ساتھ آتے آتے دیر ہوگئی ہوگی۔“ عاصم جاسوسی ناول چھوڑنے کو قطعی تیار نہ تھا۔

”ارے بھاڑ میں جائے تیرے ناول تو اٹھتا ہے کہ نہیں؟“ اماں بی چپل کھینچتے ہوئے بولیں تو عاصم میاں فوراً ناول چھوڑ کر اٹھ بیٹھے۔ برآمدے سے سائیکل نکالی اور شوبی کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہتے ہوئے اسکول کی طرف چل پڑے۔ شوبی میاں اگر تم وقت پر گھر آجاؤ تو مجھے یوں چلچلاتی دھوپ میں باہر نہ نکلنا پڑے۔

وہ اسکول پہنچا تو گیٹ بند ہوچکا تھا...... بوڑھا چوکیدار آم کے درخت کے نیچے آرام کررہا تھا۔

”بابا...... بابا...... ارے...... با...... با“ عاصم میاں پوری قوت سے چیخے تو چوکیدار نے نیند سے بھری آنکھیں کھولیں۔

”کیا ہے بچہ؟“

”بابا سب بچے چلے گئے؟“ عاصم نے سہم کر پوچھا۔

”خوچہ تم کو نظر نہیں آتا؟ ادھر سارا اسکول خالی پڑا ہے؟“ چوکیدار نے غصے سے گرج کر کہا۔

”بابا ہمارا بھائی شوبی ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔ عاصم آنسو بھرے لہجے میں بولا۔

”اوئے ...... یہ تو بڑا ہوا بچہ ...... تم اس کے دوستوں کے گھر پتا کرو، کہیں کسی دوست کے گھر نہ چلا گیا ہو۔ کیوں کہ ادھر سے سب بچہ، سب بابا لوگ اپنے اپنے گھر کو گیا ہے......“ چوکیدار کا لہجہ ایک دم نرم ہوگیا۔

عاصم میاں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... ”اللہ میاں، میرے اچھے اللہ میاں، شوبی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا...... اچھے اللہ میاں میرا آپ سے وعدہ ہے اب کبھی بھی شوبی سے نہیں لڑوں گا۔“ عاصم دل ہی دل میں شوبی کی سلامتی کی دعا کرتے

ہوئے اس کے تمام دوستوں کے گھر پتا کرنے گیا...... مگر شوبی میاں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے...... وہ مایوس ہوکر گھر لوٹ آیا۔

اماں بی اس کو تنہا اور مایوس دیکھ کر بیہوش ہوگئیں۔ بڑی آپا کی روتے روتے آنکھیں سوج چکی تھیں...... دادی اماں مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں...... ڈیڈی الگ کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

"آخر یہ لڑکا گیا کہاں؟"

"وہ پریشانی میں مسلسل کئی بار یہ جملہ دہرا چکے تھے۔ ٹیلیفون کئی بار کر چکے تھے...... بھائی جان مختلف جگہوں پر شوبی کو تلاش کرتے ہوئے تھک چکے تھے...... انہوں نے غصے سے سوچا شوبی کے بچے ایک بار میرے ہاتھ لگ جاؤ، میں مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔ اور پھر دوسرے لمحے اپنی اس سوچ پر انہوں نے خود کو زبردست ملامت سے نوازا۔

شام کے سائے دھیرے دھیرے رات کے اندھیروں میں گم ہورہے تھے، گھر پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا...... دوپہر کا کھانا میز پر رکھے رکھے ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ پر وہاں کسے کھانے پینے کا ہوش تھا۔ سب کے سب شوبی کی سلامتی کی دعا کررہے تھے۔ رشتہ دار خواتین اپنے ڈراؤنے خیالات کا اظہار کرکے اماں بی کو تڑپا رہی تھیں۔ اچانک ڈیڈی غصے سے بولے،

"تم لوگوں نے اسے کچھ کہا تو نہیں تھا؟" ڈیڈی خوفناک انداز میں بڑی آپا، بھائی جان اور عاصم میاں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ اس بات پر اماں بی بھی بستر سے اٹھ بیٹھیں۔ دادی اماں کی آنکھوں میں بھی شک کے سائے لہرانے لگے۔

"ڈیڈی ہم نے اسے کچھ بھی نہیں کہا، بلکہ ہم نے تو ایک ایک روپیہ اسے ہوم ورک صاف ستھرا کرنے پر انعام بھی دیا تھا۔" بڑی آپا اور بھائی جان ایک ساتھ بولے۔

اب تو عاصم میاں کی حالت غیر ہوگئی۔ انہیں رات کی اپنی معرکہ آرائی یاد آگئی۔

"عاصم میاں۔" ڈیڈی گرجے۔

"ج...... ج...... جی...... ی ی...... ڈیڈی......" عاصم میاں کی کپکپاہٹ چھوٹ

گئی۔ "تم بتاؤ۔" ڈیڈی سختی سے بولے۔ وہ جلد سے جلد کسی نتیجے پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔

"ڈیڈی رات ناول کے لئے میری اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ میں نے جب لائبریری سے جاسوسی ناول لانے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر مجھے غصہ آگیا، میں نے اسے کاہل، ست کہنے کے ساتھ یہ کہہ دیا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی نیکی اور اچھائی کا کام نہیں کر سکتا۔" عاصم میاں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولے۔ ڈیڈی شوبی میری باتوں سے ناراض ہو کر کہیں گھر چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا؟ یہ احساس عاصم کو رلا رہا تھا۔

ڈیڈی کی ہمت بھی جواب دیتی جارہی تھی۔ اماں بی تو کبھی سے صبر کا دامن چھوڑے مسلسل روئے جارہی تھیں۔

اچانک کال بیل کی آواز گونجی تو گھر میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی ...... شوبی کہیں لوٹ کر تو نہیں آگیا۔ یہ خیال سب کے دل میں خوشی بن کر چھا گیا۔

دینو بابا نے جلدی سے دروازہ کھولا ...... سامنے نومی کھڑا تھا۔ "انکل۔" وہ سیدھا ڈیڈی کے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" سدا کے سخت مزاج ڈیڈی ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولے۔

انکل شوبی اسپتال میں آپ سب کا منتظر ہے۔ یہ سنتے ہی اماں بی، آپا اور دادی اماں دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔

"خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔" ڈیڈی پریشان ہو کر بولے تو کمرے میں اچانک خاموشی چھا گئی۔

"نومی میرا بیٹا خیریت سے تو ہے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"جی انکل وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"چلو۔" ڈیڈی نے کہا اور سب گھر والے ڈیڈی کے ساتھ وین میں بیٹھ گئے۔ اور شوبی کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہے......

اسپتال کے کمرے میں شوبی آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"شوبی میرے لعل۔" اماں بی شوبی کو سینے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

"میرے بچے کو کیا ہوا...... شوبی کو کیا ہوا؟ دادی اماں نے شوبی کا ہاتھ تھام لیا۔

ڈاکٹر صاحب ڈیڈی کے قریب آتے ہوئے بولے۔

"آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کا بیٹا ایک دردمند انسان ہے جو دوسروں کے دکھوں پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس معصوم لڑکے نے اپنا خون دے کر ایک انسان کی زندگی بچالی۔ اگر یہ لڑکا رضاکارانہ طور پر حاضر ہو کر اپنا خون نہ دیتا تو ہم اس مریض کی زندگی نہ بچا سکتے تھے۔ اور یوں ایک خاندان بکھر جاتا، دکھی ہو جاتا۔" ڈاکٹر صاحب ایک مریض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے جس کے بیڈ کے قریب ایک خاتون اور تین معصوم بچے بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈیڈی کا سر فخر سے بلند ہو گیا...... وہ شوبی کے پاس آ کر بولے۔ "بیٹا تم نے بن بتائے اتنا بڑا کام کر لیا۔"

"معاف کر دیجئے ڈیڈی دراصل میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ اگر میں گھر اطلاع دینے آجاتا تو ممکن تھا کہ میں اسپتال وقت پر نہ پہنچ پاتا جس سے ایک قیمتی انسانی زندگی ضائع بھی ہو سکتی تھی۔

دراصل ڈیڈی میں چھولے والے کے ٹھیلے کے قریب چھولے کھا رہا تھا کہ ریڈیو پر اعلان سنا کہ ایک شدید زخمی شخص کو فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔ اور پھر خون کا گروپ بھی وہی تھا جو میرا گروپ ہے۔ لہٰذا میں ایک جذبے کے ساتھ اسپتال کی طرف چل پڑا اور پھر ڈیڈی میں عاصم بھائی کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ میں بھی نیکی اور اچھائی کا کام کر سکتا ہوں۔" شوبی نے آہستہ سے سر اٹھا کر عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عاصم لپک کر شوبی کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا، "تم بہت اچھے ہو شوبی! مجھے تم پر فخر ہے۔"

عاصم کی یہ بات سن کر گھر کے تمام افراد کے چہرے فخر کے احساس سے جگمگا اٹھے۔

سنہرے موتی

شمیم اقبال محسن، راولپنڈی

○ ...... کسی کا دل مت دکھاؤ، کیونکہ دکھی دلوں کی فریاد آسمانوں کا جگر چیر دیتی

ہے۔

○ ...... جو دوسروں کے غم سے بے نیاز ہے، وہ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں۔

○ ...... مت چنو ایسے پھول جو ہنستی مسکراتی زندگی کو اجاڑ دیں۔

○ ...... اگر تو گناہ کرنا ہی چاہتا ہے تو ایسی جگہ کر جہاں خدا موجود نہ ہو۔

○ ...... اگر دنیا میں عزت چاہتے ہو تو زبان کو قابو میں رکھو۔

○ ...... شیریں زبان نہایت اعلیٰ ہتھیار ہے۔

○ ...... زندگی کے گلدان میں ایسے پھول سجاؤ جو خوشبو بھی دیتے ہوں۔

○ ...... انسان سے محبت کرنا خدا سے محبت کرنا ہے۔

○ ...... گناہ کسی نہ کسی صورت سے دل کو بے چین رکھتا ہے۔

○ ...... تعجب ہے اس پر جو شیطان سے دشمنی کرتا ہے اور پھر اس سے محبت بھی کرتا ہے۔

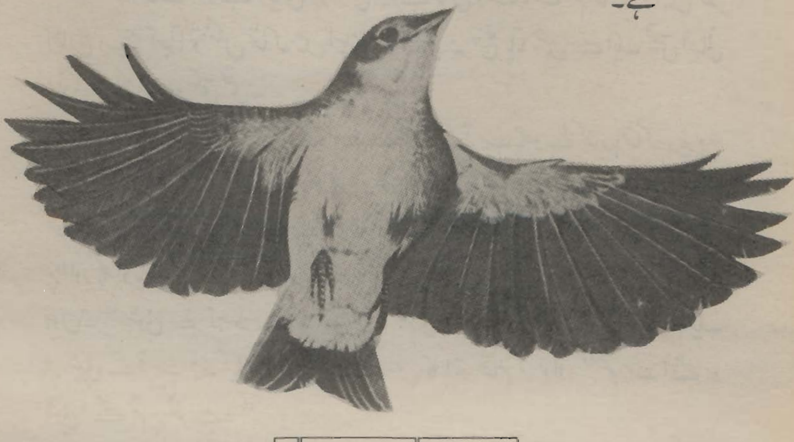

پرندوں کا بادشاہ

(جنید رحمٰن دھلوی)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک حبشی کسان اپنے کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ اتنے میں پرندوں کا بادشاہ آیا اور کہنے لگا، "میں سو پرندے بھیج دوں گا وہ تمہارا ہاتھ بٹائیں گے،

اس طرح کام جلد ختم ہوجائے گا۔" پرندوں نے خوب کام کیا اور آن کی آن میں سارا کھیت کھود ڈالا۔ دوسرے دن کسان گیہوں بونے گیا۔ اب کہ پرندوں کے بادشاہ نے اس کی مدد کے لئے تین سو پرندے بھیج دیئے۔ کسان کا کام چند گھنٹوں میں ختم ہوگیا۔

جب فصل پک کر تیار ہوگئی تو کسان اسے کاٹنے گیا۔ "اب آپ کیا کر رہے ہیں؟" پرندوں کے بادشاہ نے پوچھا۔

"میں فصل کاٹ رہا ہوں۔" کسان نے کہا۔ "لایئے میں آپ کی مدد کروں۔" یہ کہہ کر پرندوں کے بادشاہ نے ایک لاکھ پرندے بھیج دیئے۔ پرندوں نے منٹوں میں سارا کھیت کاٹ کے رکھ دیا۔ اور پھر خوشی میں سارے دانے نکال کر کھا گئے۔ کسان نے اپنا سر پیٹ لیا۔

آوازوں کے رنگ

(عائشہ خالد، کراچی)

اگر کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ آپ کی آواز کس رنگ کی ہے تو آپ یقیناً اس کی ذہنی حالت پر شک کریں گے۔ مگر یہ سچ ہے کہ آوازوں کے بھی رنگ ہوتے ہیں۔ جیسے ہماری آوازوں کا موسیقی کی تانوں سے رشتہ ہے ویسے ہی ہماری آوازیں ایک بڑے رنگوں کے چارٹ کے مطابق ہوتی ہیں۔ آپ نے نیلی آوازیں سنی ہوں گی اور لال، کالی، سبز اور سفید بھی۔

گلابی آوازیں کافی عام ہیں اور براؤن اور پیلی بھی۔ اور جس طرح رنگ ہمارے اعصاب پر اثرانداز ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح آوازیں بھی ہمارے اعصاب پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ اگرچہ ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔

نیلی آوازیں ڈپریسنگ (DEPRESSING) ہوتی ہیں، سبز کھردری یا تیز ہوتی ہیں، بھوری (BROWN) آوازیں سخت اور موٹی ہوتی ہیں، لال آوازیں تازہ مگر کافی پتلی ہوتی ہیں جو روزانہ سننے میں بھی اچھی نہیں لگتیں۔

پیلی آوازیں اونچی، بور، زنانی آوازیں ہوتی ہیں جو نہ ٹھنڈی ہوتی ہیں نہ گرم اور جو

ایک انسان ہر جگہ ہر وقت سنتا ہے جبکہ سلیٹی (GREY) آوازیں سب سے زیادہ عام مردانہ ہوتی ہیں۔ وہ عام طرح کی ہوتی ہیں۔ جن میں کم یا بالکل کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ وہ گہری، زیادہ طاقتور یا زیادہ مردانہ نہیں ہوتی ہیں۔

جس طرح ہم موسیقی سننے اور رنگوں کو پسند ناپسند کرنے کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح آوازوں کے معاملے میں بھی ہمارے احساسات خاصے تیز ہوتے ہیں۔

دلچسپ واقعہ
(فلزہ جمیل)

چاندنی رات تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں، ہر طرف سناٹا تھا۔ اس ویرانی کو دیکھ کر دل سہما جا رہا تھا۔ اس عالم میں محمود اپنے کمرے میں اکیلا سو رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دور میدان کو دیکھا، میدان دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پورے میدان نے چاندنی اوڑھ لی ہے۔ ابھی وہ میدان دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک دور گھنے درخت کے نیچے، اس کی نظر ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے کسی چیز پر پڑھی۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی، آخر یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟ یہ کوئی بھوت تو نہیں، جو قبرستان سے آگیا ہو یا کوئی مردہ تو نہیں جو کفن پہنے ہو یا روح تو نہیں

جو سفید چاندنی رات میں سیر کرنے چلی آئی ہو؟ اس نے اسے پھر دیکھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیران اور پریشان تھا۔ وہ اس طرح بہت دیر تک سوچتا رہا اور ڈرتا رہا کہ آخر یہ کیا ہے؟ سوچتے سوچتے اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن صبح کے وقت جب محمود اٹھا تو اسے اسی چیز کا پھر خیال آیا جو سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ جلدی سے بستر سے اٹھا اور اس چیز کو دیکھنے کے لئے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جھانکا، کیا دیکھتا ہے کہ دور میدان میں کھڑے اس گھنے درخت کے ساتھ ایک سفید گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں ملیں اور پھر غور سے دیکھا۔ واقعی وہ گائے ہی تھی۔ گائے کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا اور اپنے اوپر بہت ہنسی آئی کہ رات اس گائے نے تو اس کی جان ہی لے لی تھی۔ وہ جلدی سے امی، ابو کے پاس آیا، جو ناشتہ کر رہے تھے۔ محمود نے رات کا قصہ انہیں سنایا۔ یہ قصہ سن کر امی ابو زور زور سے ہنسنے لگے۔

زمین خطرے میں ہے

(نکہت غیاث، کراچی)

نظام شمسی کے نو سیارے ہیں۔ جن میں ہماری زمین سب سے خوبصورت سیارہ

ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انسانوں کیلئے ایک عطیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوق سے بڑا درجہ دیا ہے اور اسے اس دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے۔ انسان مختلف ادوار سے گزر کر ہی ترقی یافتہ انسان کہلایا ہے۔

دوسری مخلوقات نے اتنی ترقی کیوں نہیں کی؟ دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ہی وہ خصوصیات پیدا کی ہیں جن کی بنا پر اس نے ترقی کی ہے۔ انسان کے اندر جستجو کا مادہ بھرا ہوا ہے۔ ہر انسان اپنے طور پر ایک سائنس دان ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ کسی میں زیادہ جستجو پائی جاتی ہے۔ اور وہ اس کائنات کے راز دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جنہیں ہم عام طور پر سائنس دان کہتے ہیں۔

انسان فطرتاً ایک سست مخلوق ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اس لئے اس نے اپنے لئے مختلف اوزار، مختلف مشینیں وغیرہ بنائیں جن کی بدولت بڑے بڑے کارخانے وجود میں آئے۔ ان کارخانوں میں بننے والی چیزیں ہمارے لئے فائدہ مند تو ہیں، مگر ان کارخانوں سے خارج ہونے والے فاضل مادے کی وجہ سے ہماری زمین ہر طرف سے آلودہ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری فضا بھی آلودگی کا شکار ہوگئی ہے۔

موجودہ دور میں سب سے صاف اور آلودگی سے پاک خطہ انٹارکٹیکا ہے۔ وہاں پر مختلف ممالک کے سائنس دان تحقیق کرنے جاتے ہیں اور مختلف رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اب تو وہاں سیاحوں کی بھی آمدورفت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہاں مختلف مشروبات کے خالی ڈبے اور دوسرا کوڑا کرکٹ جمع ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں کے جانور متاثر ہوتے ہیں۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ انسان کے تحقیقی کام میں جانوروں کا بے حد نقصان ہوتا ہے۔ بلکہ کئی جانوروں کی نسل ختم ہو رہی ہیں لیکن انسان چین سے نہیں بیٹھ سکتا کیوں کہ وہ ہر وقت اس خوبصورت دنیا کے مختلف رازوں کے بارے میں سوچتا ہے اور اس لئے وہ راز معلوم کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔

جس طرح جانور اور اس دنیا کے خوبصورت مناظر انسانوں کی تحقیق کی نذر ہوجاتے ہیں، اسی طرح انسان بھی مختلف بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ انسان نے چند بیماریوں پر قابو پا تو لیا ہے مگر روز بروز بیماریوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے اور کینسر جیسی خطرناک بیماریاں ہمارے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں۔

انسان کی تحقیقات کے نتیجے میں زمین کی ہر شے آلودہ ہو رہی ہے۔ خشکی، سمندر اور فضا غرضیکہ ہر شے متاثر ہے جو کہ سب سے بڑھ کر انسان کے لئے خطرہ ہے۔ مگر انسان کیا کرے؟ وہ اپنی تحقیق و جستجو کی قوت پر قابو نہیں پا سکتا۔ انسان اس زمین کے تمام راز دریافت کرنے کا خواہشمند ہے، مگر زمین کا مستقبل آلودگی کی وجہ سے سخت خطرے میں ہے۔

بہادر نوکر
(فہد علی خان، کراچی)

ہمارے ایک دوست لاہور میں رہتے ہیں۔ وہ جب بھی کراچی آتے ہیں، اپنے ساتھ اپنا ایک نوکر ضرور لے کر آتے ہیں۔ ایک دن ہم نے ان سے پوچھا کہ "بھئی آپ اپنا نوکر ساتھ لئے کیوں پھرتے ہیں؟"

"بھئی یہ بڑا بہادر ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اچھا کوئی کارنامہ سناؤ ان کا۔" ہم نے ان سے کہا۔

"چلو اس کے پاس۔ خود ہی سن لینا۔" ہمارے دوست نے کہا۔

ہم نے نوکر سے کہا کہ وہ اپنی بہادری کا کوئی قصہ سنائے۔ اس نے کہا، "اچھا بھئی۔"

"اجی! اک بار ایسا ہوا کہ ہمارے صاحب کے پیچھے ایک آدمی چل رہا تھا، ہم نے تیل مل لیا سی، لنگوٹ کس لیا سی، فکر دی کوئی گل نہیں سی۔ وہ شخص آگے آگے، ہم پیچھے پیچھے۔ تیل مل لیا سی، لنگوٹ کس لیا سی، فکر دی کوئی گل نہیں سی۔ ہمارے صاحب کشتی میں بیٹھ گئے، وہ آدمی بھی کشتی میں بیٹھ گیا۔ ہم نے تیل مل لیا سی، لنگوٹ کس لیا سی، فکر دی کوئی گل نہیں سی۔ ہم نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔"

"پھر کیا ہوا؟ ہم نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، لنگوٹ گم گیا سی، تیل ملا کا ملا رہ گیا سی، فکر ساری ختم ہو گئی سی۔" اس نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا اور ہمارا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

ساتھی بچپن کے

عمران ناصر ۱۵ سال دہم
انگلش انجینئر ڈریم لینڈ اسکول
این/۴۹ پی، آئی، بی کالونی کراچی

صداقت حیات شاہد ۱۵ سال دہم
اردو ادیب گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول لاوہ
مین بازار لاوہ تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال ڈاکخانہ لاوہ

محمد اعجاز ۱۴ سال نہم
بیالوجی آرمی گورنمنٹ ہائر اسکول
معرفت ڈاکٹر محمد شریف کٹھہ سگھرال ضلع خوشاب

اشفاق مغل ۱۴ سال نہم
بیالوجی ادیب گورنمنٹ ہائی اسکول
مکان ۱۵، گلی ۱۹۳ محلہ شاہ عبدالغنی باغبانپورہ لاہور

راؤ محمد اسلم ساجد ۱۲ سال ہشتم
انگلش ڈاکٹر ہائی اسکول جلال آباد
جلال آباد، لودھراں

صفدر عیاث ۱۰ سال پنجم
سائنس کھلاڑی حبیب پبلک اسکول
ڈی ۲۴۴۲، بلاک ۴ میٹرو ول نمبر ۱ سائٹ کراچی ۱۶

کیڈٹ راؤ ذیشان ۱۴ سال ہشتم
حساب فوج کیڈٹ کالج پٹارو
جوہر عتیق اینڈ کمپنی، موتی بازار نواب شاہ

نظیر سندھی ۱۷ سال بارھویں
سائنس انجینئر گورنمنٹ ڈگری کالج
پرنس سائیکل ورکس رئیس سینما روڈ

محمد نصراللہ ٹ ۱۵ سال دہم
انگلش پولیس آفیسر ابن خلدون اسکول
شاہد کریانہ مرچنٹ محلہ رتن تلاؤ ڈاکخانہ خاص تحصیل و ضلع راجنپور

سید صالحین اظہار ۱۶ سال دہم
ریاضی کرکٹر بی جے پبلک
بی ۲۵، امبرین اپارٹمنٹ بلاک ۲ گلشن اقبال کراچی

محمد شمیم ۱۶ سال نہم
انگلش کرکٹر اسکالرز سیکنڈری اسکول
۴۴۶ - ایم بلاک، سیکٹر ۱۱ اورنگی ٹاؤن کراچی

عدیل عبدالرزاق ۱۴ سال ہشتم
انگلش بزنس مین سپریئر ماڈل اکیڈمی
۱۳۲۹/۳ حسین آباد میمن کالونی فیڈرل بی ایریا کراچی

محمد نسیم رفیع ۱۵ سال دہم
انگلش اداکاری گورنمنٹ تعمیر نو ہائی اسکول
مکان نمبر ای - ۲۸۸ ، بھوسہ لائن سکھر

شعیب محمد ۱۵ سال نہم
کیمسٹری اچھا انسان گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول
۵۲۱/بی بلیر کالونی کراچی

محمد منیر خان ۱۳ سال ہشتم
انگلش انجینئر گورنمنٹ بوائز ایگرو ٹیکنیکل اسکول
۱۷/۲۶۹ یسین آباد فیڈرل بی ایریا ، کراچی

محمد رفیق اکبر ۱۶ سال نہم
ریاضی فوجی آفیسر گورنمنٹ زینت الاسلام اسکول
آزاد بیٹری م ۴۷ - حیدر آباد

طاہر محمود خان ۱۳ سال ہفتم
انگلش انجینئر پشاور پبلک اسکول
چارسدہ ریلوے اسٹیشن ، ضلع چارسدہ

محمود اسعد ۱۷ سال عربی
عربی مبلغ مدرسہ عربیہ
کریم ڈرائی ٹو شیخ دکاندار گلشیر کندکوٹ

محمد نعیم ۱۲ سال ہفتم
اردو کرکٹر
۱۴-۱ اے نشتر آباد ، ماڈل کالونی کراچی

طارق فرید چشتی ۱۴ سال دہم
کیمسٹری ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
چک نمبر ۵۰۷ ، ای بی ، بورے والا (وہاڑی)

ریاض رضا ۱۵ سال ہفتم
عربی ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
رفیق عیسیٰ الیکٹرونکس دکان مین روڈ آب سر تربت

شکیل احمد عمرانی ۱۶ سال دہم
انگلش ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
آب سر ضلع تربت مکران ، بلوچستان

شکیل عباس صابری ۱۴ سال ہشتم
عربی فوج میں گورنمنٹ ہائی اسکول
محلہ خوشدل وارڈ ، ضلع راجن پور

مرزا صاحب کی بیٹی

مرسلہ: محمد اشعر القسام کراچی

مرزا صاحب کی بیٹی
طوطا ہاتھ میں لیتی
طوطا باغ میں جاتا
سوسو کو سنے کھاتا

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ____________________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________________

رقم ____________ بذریعہ ____________

پتہ ____________________

____

فون نمبر ____________

MAGGI®
"mmm...Maggi!"
2-MINUTE NOODLES
MAGGI®
2-MINUTE NOODLES
CHICKEN
چکن
TASTEMAKER INSIDE
FAST TO COOK! GOOD TO EAT!

REGD. No. M-266 OCTOBER 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI